فکرِ غالب
از
پرتھوی چندر

بار اول ۱۲۰۰ مئی ۱۹۶۰ء

مطبوعہ پیام وطن پریس دہلی - ناشر پرتھوی چند

فکرِ غالب

نیو تاج آفس اردو بازار دہلی

قیمت ۳/-

مرزا غالب

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

میں اپنی ناچیز تصنیف کو جناب لالہ منہرلچ صاحب ساہنی،
ممتاز سینیئر ایڈوکیٹ دہلی کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

جن کو باوجود اپنی گوناگوں مصروفیات کے
مرزا غالب کے کلام سے خاص دلچسپی ہے اور مرزا غالب
کے اشعار کی بہترین شرح سے واقف ہیں اور مرزا غالب کے
لطائف وظرائف سے ادبی صحبت کو نہایت دلچسپ اور
پرکیف بنا دیتے ہیں۔

ع گر قبول افتد زہے عز و شرف

"پرتھوی چند"

کچھ تصاویر کے متعلق

اس کتاب میں مرزا غالب کے متعلق چار تصویریں دی گئی ہیں۔

(۱) مرزا غالب کی تصویر۔

(۲) تصویر جائے ولادت مرزا غالب بمقام آگرہ۔

یہ مقام کالا محل (کالاں محل) کے نام سے مشہور ہے جو پیپل منڈی آگرہ میں اب بھی موجود ہے۔ جہاں مرزا غالب پیدا ہوئے اور شادی ہونے تک اپنی والدہ کے ہمراہ اپنے نانا خواجہ مرزا غلام حسین کے یہاں رہے۔

(۳) مرزا کی جائے رہائش بمقام دہلی۔

یہ اُس مسجد کی تصویر ہے جس کے عقب میں مرزا غالب کرایہ پر مکان لیکر اپنی عمر کے آخر لمحات تک مقیم رہے۔ اور جس کے متعلق مرزا غالب نے ایک شعر کہا تھا۔ مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے۔

(۴) آخر میں اک تصویر مرزا غالب کے مزار کی ہے جو حضرت نظام الدین اولیا کے مزار سے کچھ فاصلے پر مشرق کی طرف واقع ہے۔

یہ مزار پہلے خستہ حالت میں تھا جس کو نئے سرے سے سنگ مرمر سے تعمیر کیا گیا ہے۔

فکرِ غالبؔ

از جناب تلوک چند محروم صاحب

نئی دلّی کے ممتاز تاجر شری پرتھوی چند کی تالیف فکرِ غالب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے کلامِ غالب کا بہ نظرِ غائر مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ مرزا کے نام اور کلام سے عشق ہے۔ یہ کتاب "غالبیات" کے ذخیرہ میں ایک مفید اور دلچسپ اضافہ ہے۔ اس میں مرزا غالب کے حالاتِ زندگی۔ عادات۔ وخصائل اور خصوصیاتِ کلام وغیرہ کے بارہ پر سیر حاصل محنت کی گئی ہے۔ مرکزی باب جو ۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک نظر کی توجہ کا خاص طور پر مستحق ہے۔ یہ باب غالب کے اس مصرعہ کی توضیح معلوم ہوتا ہے۔ ؏

غالب کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

اس میں غالب کے نقادوں اور شارحین پر تنقید کی گئی ہے

جو دلچسپ ہونے کے علاوہ خیال انگیز بھی ہے۔

علاوہ ازیں مرزا کے چند ضروری خطوط بھی شامل ہیں جن کا مرزا غالب کی زندگی اور اثر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اکثر دیوانِ غالب کا انتخاب بھی دے دیا گیا ہے جو مؤلف کی ذوقِ سلیم کا مظہر ہے۔

غرض مرزا غالب کے حالات اور ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے والے حضرات کے لئے یہ کتاب ذریعہ مسرت اور طلباء کے لئے ایک مفید امدادی کتاب ثابت ہوگی۔

تلوک چند محروم
۲۲ر مارچ سنہ ۱۹۶۰ء

فکرِ غالب

از جناب امتیاز علی عرشی رام پور

مکرمت نامہ اور "فکرِ غالب" دونوں نے میری عزت بڑھائی کتاب پڑھکر میں حیرت میں پڑ گیا کہ آپ نے کس چابک دستی سے اپنے لئے غالب کے کام کرنیوالوں میں ایک عمدہ مقام حاصل کر لیا شاید یہ اچھوتا انداز کسی کے ذہن میں بھی نہ آیا ہوگا۔ کم از کم میں تو اس کے دیکھنے سے پہلے یہ نہ سوچ سکا کہ اس ڈھنگ پر بھی کوئی دلچسپ کتاب غالب پر لکھی جا سکتی ہے۔ خدا آپکو مزید کام کی توفیق عطا فرمائے۔

غالب کے دیوان کے بارے میں آپ کی جو سکیم ہے مجھے اُس سے کلی اتفاق ہے۔ آپ خدا کا نام لے کر یہ کام شروع فرما دیجئے اور اس کام میں کوئی مشورہ مجھ سے کرنا ضروری ہو تو بلا تکلف لکھئے میں حاضر ہوں۔ ہر خدمت بجا لاؤنگا۔

مخلص :-

عرشی

(Omitted margin annotation)

پرتھوی چندر

دیباچہ

جب سے دُنیا قائم ہوئی ہے اس کے ہر دور میں ایسی قابل ترین ہستیاں پیدا ہوتی رہی ہیں جو اپنی ادبی خدمات اور درخشاں کارناموں کی وجہ سے زندہ جاوید ہیں آنے والی نسلیں ہمیشہ ان کے کارناموں پر فخر کرتے ہوئے عقیدت کے پھول ان پر نچھاور کرتی رہیں گی۔ فلسفہ اور حکمت میں بقراط، سقراط۔ ارسطو اور افلاطون شاعری میں فردوسی، ظہوری، سعدی۔ سودا۔ میر تقی میر۔ دیا شنکر نسیم اور ذوق اور نثر نگاری میں اور انشا پردازی میں رجب علی بیگ سرور۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ ڈپٹی نذیر احمد مولانا محمد حسین آزاد۔ منشی پریم چند اپنے درخشاں کارناموں کی وجہ سے تمام عالم میں مشہور ہیں۔ ان ہی مشہور ہستیوں میں سے مرزا غالب بھی تھے۔ جو آج سے سوا سو سال پیشتر ظفر بادشاہ کے زمانے میں ہوتے اور مومن ذوق نواب شیفتہ مولانا آذردہ ان کے ہم عصر تھے۔

ولی سے لیکر مومن اور ذوق کے زمانے تک بیشمار شاعر نظر آتے ہیں لیکن غالب کی شاعری کا رنگ سب سے جُدا ہے وہ رفعت خیال جدت بیان اور گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اپنے ہم عصر اور شعرائے

متقدمین اور متاخرین میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض ہم عصروں کا کلام تذکروں ہی تک محدود رہ گیا ہے لیکن مرزا غالب نے چمنستان شاعری میں ایسے سدابہار پھول کھلائے ہیں جن کی خوشبو ابھی تک چلی آتی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

شیکسپیر اپنے زمانے میں ایک معمولی ایکٹر اور ڈرامہ نویس تھا۔ لیکن مرنے کے بعد اس کے ڈرامے لافانی شاہکار سمجھے جاتے ہیں اور اس کے ڈراموں اور ادبی مضامین کو نہایت اعلیٰ طباعت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے اور شیکسپیر اپنے زمانے سے اب زیادہ مشہور اور ممتاز ہستی شمار کی جاتی ہے اسی طرح شیخ سعدی جو گلستاں اور بوستاں کے مصنف تھے اپنے زمانہ میں مشہور نہ ہو سکے لیکن آج کل ان کو مسلم الثبوت شاعر مانا گیا ہے ان کی تصانیف گلستاں بوستاں کا تمام دنیا میں چرچا ہے۔

مرزا غالب بھی ایک ایسے شاعر تھے جو اپنے زمانے میں ان کے ہمعصر شاعروں نے ان کو سبقت نہ لینے دی اور کوئی نہ کوئی ادبی جھگڑا اور فساد برپا کئے رکھا۔ مگر زمانے نے وقت آنے پر انکی قدر کی اور ہو رہی ہے اور آج کل اپنی ہند سرکار نے اسی شاعر کے کلام اور ادبی خدمات کو سراہا ڈاک کے ٹکٹوں پر ان کی تصاویر شائع ہوئیں۔ اور قوم کی طرف سے ہر سال برسی منائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں پر ان کا کلام اور حالات نشر کئے جاتے ہیں ان کا مزار حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار

کے نزدیک خستہ حالت میں تھی اب ایک بڑا دالان ساتھ شامل کر لیا گیا اور اسی کا فرش سنگ سرخ سے خوشنما بنا دیا گیا ہے اور مزار کو نئے سرے سے سنگ مرمر سے مزین کیا گیا ہے لوگ جو دہلی دیکھنے کے لئے آتے ہیں ان کے لئے اور تمام ہندوستان اور غیر ممالک کے لئے ایک زیارت گاہ بن گئی ہے

مرزا کو اپنی زندگی میں پریشانیوں کا خوب مقابلہ کرنا پڑا جس کا ذکر کتاب ہذا میں آتا ہے، اپنی زندگی میں ہمیشہ تنگدستی سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور ان کی قدر و منزلت نہ ہوئی جس کے کہ وہ لائق تھے۔ اگرچہ نواب رامپور نے مرزا غالب کی بہت مدد کی، جب تک مرزا زندہ رہے سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی رہی۔ تنخواہ کے علاوہ وہ نواب صاحب وقتاً فوقتاً مرزا غالب کی مالی امداد بھی کرتے رہے۔ اگر یہ مدد نہ ہوتی تو نہ معلوم مرزا کو کتنی تکالیف اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا۔

مگر یہ قدر و منزلت اس بڑھیا کی سی تھی جو ایک سوت کی انٹی لے کر یوسف کو بازار سے خریدنے گئی تھی جیسا کہ مرزا غالب نے بھی لکھا ہے۔

جو چاہئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسف بقیمت اوّل خریدہ ہوں

مرزا صاحب کے شاگردوں کا سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ جو اپنا کلام اصلاح کے لئے ان کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ان کے

شاگردوں میں سے چند شاگردوں کے نام نامی یہ ہیں۔

(۱) مولانا حالی۔ مصنف مقدمہ شعر و شاعری و یادگارِ غالب

(۲) مولانا اسمٰعیل میرٹھی۔ جن کی اردو ریڈریں لاجواب سمجھی جاتی ہیں۔

(۳) نواب شیفتہ۔ جو مرزا غالب کے بڑے دوست تھے اور اردو فارسی کے زبردست شاعر تھے۔

(۴) ہرگوپال تفتہ۔ جن کو مرزا غالب مرزا صاحب کہہ کر پکارتے تھے اور جن کو مرزا غالب نے سب سے زیادہ خطوط لکھے تھے۔

(۵) منشی شو نرائن آرام۔ جو آگرہ میں ایک مشہور مطبع کے مالک تھے جن کے خاندان اور اپنے خاندان کے آمیزش کے تعلقات کا احوال خود مرزا صاحب نے ایک خط میں مفصل دیا ہے۔

(۶) میر مہدی مجروح۔ جن کو مولانا غالب نے محبت آمیز خطوط سب سے زیادہ لکھے ہیں۔

(۷) جواہر سنگھ امراؤ سنگھ۔ دونوں سگے بھائی اور دونوں تحصیلدار تھے اور غالب سے ان کی خاص عقیدت تھی۔

(۸) بہاری لال عاصی۔ جنہوں نے گلستان اور بوستان کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

(۹) بابو ہرگوبند سہائے نشاط۔ اہل وطن پٹنہ تھا مگر آگرہ آکر گوبند گنج آباد کیا۔ دیوان نشاط کے علاوہ بہت سی تصانیف چھوڑیں۔

گو دلی کے تعلیم یافتہ طبقوں میں مرزا غالب کے کلام کی قابلیت کو تسلیم کیا گیا مگر ظفر بادشاہ نے غالب کی قابلیت سے متاثر ہو کر ان کو اپنے ولی عہد مرزا جواں بخت کا اتالیق مقرر کیا اور چار سو روپیہ سالانہ مشاہرانہ مقرر ہوا۔ جب کہ ذوق چار روپیہ ماہوار پر ظفر بادشاہ کی ولی عہدی کے زمانے میں اُستاد مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ ظفر بادشاہ نے مرزا غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک کا خطاب دے کر شاہان تیموریہ کی تاریخ بزبان فارسی لکھنے پر مامور کیا۔ حالانکہ یہی خدمت وہ دوسرے شعرار اور ادیبوں سے بھی لے سکتے تھے مگر بادشاہ نے اس خدمت کے لئے مرزا غالب ہی کو اہل سمجھا اور جس سے ظاہر ہوا کہ مرزا غالب کو اپنے تمام معصروں پر سبقت حاصل تھی۔

سودا، میر تقی، مرزا غالب ہی ایسے شاعر ہیں جو موجودہ زمانے میں اپنے زمانے سے زیادہ مشہور ہیں یوں تو مومن اور ذوق کا کلام بھی موجود ہے لیکن مرزا غالب کے کلام میں آخر وہ کیا خوبی ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام کی بے شمار شرحیں لکھی گئیں ہیں اور لکھی جاتی ہیں اور ان کے دیوان کے کئی قسم کے ایڈیشن شائع ہوتے رہتے ہیں۔

شارحین کی شرح نظر سے گذریں اور مصنفوں نے مرزا کے کلام کو دوسرے ہمعصر شعرار کے کلام سے کمتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے بعض نے ان کے کئی اشعار کو مہمل قرار دیا ہے۔ اور بعض نے ان کے کلام میں اس طرح اصلاح فرمائی ہے جیسے ایک کامل استاد اپنے ایک معتقد شاگرد کو اصلاح دینا ضروری سمجھتا ہے ان حضرات نے مرزا کے کلام کے مقابلہ

میں دوسرے ہمعصروں کے کلام کو سراہا اور خواہ مخواہ موازنہ کیا اور جو کچھ انھوں نے غالب کی مخالفت میں لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے، بلکہ جانبداری ہے۔

جو حضرات مرزا غالب اور ان کے ہمعصروں کا مقابلہ کرتے ہیں نہ کوئی ادبی خدمت انجام نہیں دیتے، بلکہ ان کے کلام میں رخنہ پیدا کرتے ہیں۔ ان عالم ہستیوں کی عزت کو گھٹاتے ہیں مقابلہ کرنے میں ان کی خوبیاں اور اوصاف مدھم پڑ جاتے ہیں اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ستاروں کی روشنی، ماہتاب کی روشنی سورج کی روشنی اپنی اپنی جگہ ہر ایک روشنی چمک رہی ہے لیکن اگر کوئی شخص ان روشنیوں کا مقابلہ کرنے لگے تو آپ اسے کیا کہیں گے۔ ستارے، چاند اور سورج اپنی اپنی جگہ پر ہیں اور یہی فرق کلام غالب میں اور ان کے ہمعصروں کے ساتھ ہے۔ مقابلہ ہمیشہ یکساں چیزوں کا ہونا چاہیئے ان کے ہمعصر بے شک نہایت بلند پایہ کے شاعر تھے ان کے کلام میں بھی پیچیدہ رفعت خیال اور عمدہ مضمون موجود ہیں لیکن اپنی اپنی جگہ پر بلند تر ہے کلام غالب کے متعلق ملک کے بڑے بڑے ادیب اہل قلم انشاء پرداز اور شعراء ہمیشہ غالب ہی کے کلام کی شرح لکھ رہے ہیں ورنہ دوسرے شعراء کے دیوانوں کی شرح لکھی جاسکتی ہے۔ مرزا غالب کی اپنی گوناگوں خصوصیات کے علاوہ شوخی وظرافت ان کے مضامین وحدت الوجود۔ معرفت کے اشعار حضرات صوفیہ کی مجالس میں وجد اور کیفیت پیدا کرتے ہیں مرزا کی شاعری تخیل اور جدت بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے اور صحیح ہے کہ مرزا غالب کے تخیل کی پرواز

جہاں پہونچتی ہے وہاں دوسرے شعرا کا گزر نہیں ہوا۔
تنقید نگار مومن کی ایک غزل اور ذوق کا ایک سہرا لے کر کلام غالب کا مقابلہ کرتے ہیں یہ مقابلہ آپ کو مفصل کتاب کے اندر دکھلایا گیا ہے اگر ان باکمالوں کے دیوانوں اور ان کی تمام غزلوں کا مقابلہ کیا جاتا تو کوئی بات بھی تھی صرف ایک غزل اور ایک سہرے سے ہی غالب کی بے مثال شاعری کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔
اس کتاب میں غالب کے کلام پر تنقید نگاروں پر تنقید کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے آپ پر عیاں ہو جائے گا۔ کہ ان حضرات نے غالب کے مقابلہ میں دوسرے ہمعصروں کی بے جا جانب داری کی اور کسی خاص جذبہ کے تحت ایسا کرنے پر مجبور ہوئے۔ ورنہ مولانا محمد حسین آزاد شاگرد رشید حضرت ذوق جب تک زندہ رہے کلام غالب کو ملک پر روشن نہ ہونے دیا۔ باوجود ایسا ہونے کے ان کے کلام کے کتنے ثنا خواں تھے لکھتے ہیں کہ موجودہ وہ منتخب دیوان غالب ہے جس کو ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں"
کتاب آب حیات میں بیان غالب میں ایسی ایک سطر کلام غالب کے متعلق لکھ کر حقیقت بیان کر دی، یہی الفاظ وہ اپنے استاد ذوق مرحوم کے لئے بھی استعمال کر سکتے تھے بھلا ہو حضرت حالی کا جنھوں نے یادگار غالب لکھ کر ادیبوں کے لئے ایک شاہراہ عام بنا دی اور ملک کے ہر ادیب نے کلام غالب پر شرح لکھنی شروع کر دی اور ملک میں کلام غالب ہی کی دھوم پڑ گئی اور شرح لکھنے والوں نے لکھا، خوب لکھا۔

چونکہ بعض ادیبوں نے جانبداری سے کام لیا ہے اور یہی وجہ یہ کتاب لکھنے کا موجب ہوئی مثلاً جوش ملسیانی نے شرح لکھ کر ادبی خدمت کی ہے اور ایک محقق شرح لکھی۔ مگر موازنہ ذوق و غالب میں ذوق کو سراہتے پر غالب کے ہر کلام پر اختلاف ظاہر کیا ہے اور ان کے اشعار کو مہمل بھی لکھا جس کی تفصیل کتاب میں بیان کی گئی ہے۔

اس کتاب سے آپ کو اُس زمانہ کا تہذیب و تمدن و واقعات غدر کا حال معلوم ہوتا ہے اور اس کے علاوہ مرزا غالب کا احوال ان کے اپنے خطوط عود ہندی اور اُردوئے معلیٰ سے بھی ظاہر ہوتے ہیں اور چند خطوط کتاب ہذا میں غزلوں کے علاوہ بھی شامل کر دیئے گئے ہیں اور بہت سے اشعار بھی علیحدہ درج کئے گئے ہیں جس سے کلام غالب کی غزل گوئی و نثر نگاری کی بھی پوری واقفیت ہو جاتی ہے۔ کتاب ہذا لکھنے کا مقصد تنقید نگاروں پر تنقید کرنے کا نہیں اور نہ کسی قسم کی شکر رنجی پیدا کرنے کا مدعا ہے بلکہ آئندہ شرح لکھنے والے اصحاب سے درخواست ہوگی کہ جانبداری بہر صورت ایسے ادبی کام میں نہ لانی چاہیئے کتاب ہذا لکھنے کے لئے بہت سی شرحوں اور ہر طرح کی کتابوں سے جو احوال غالب سے تعلق رکھنی تھیں مدد لی گئی ہے اور خاص کر جناب فیاض حسین جامعی کا شکریہ کیا جاتا ہے جنھوں نے اس کام میں پورنش دلچسپی کا اظہار کیا۔

اس کتاب میں حضرت جوش ملسیانی اور حضرت طباطبائی کی شرح دیوان غالب پر بھی تنقید کی گئی ہے لیکن دونوں حضرات اپنی اپنی جگہ زبردست ادیب اعلیٰ پایہ کے شاعر اور اعلیٰ قابلیت کے مظہر ہیں۔ اس تنقید سے ان دونوں بزرگوں کی قابلیت اور اہلیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

پرتھوی چندر

مرزا اسد اللہ بیگ خاں غالبؔ کے حالاتِ زندگی

مرزا کے آباؤ اجداد

مرزا ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اُنھوں نے خود لکھا ہے کہ میرا سلسلہ نسب توران بن فریدون سے ملتا ہے۔

زمانہ قدیم میں پیشدادی ایران کا مشہور خاندان تھا جس کا بانی کیومرس تھا ایرانی اس کو نبی مانتے تھے۔ اور اس کی بڑی عزت کرتے تھے شہر بسانے کی رسم اسی نے ڈالی تھی۔

کیومرس کی وفات کے بعد اس کا پوتا ہوشنگ تخت پر بیٹھا۔ یہ بہت عادل اور رعایا پرور بادشاہ تھا اسی لئے رعایا نے اسے پیشداد "عادلِ اوّل" کے لقب سے سرفراز کیا اور اسی وجہ سے اس خاندان کا نام پیشدادی پڑ گیا۔

فردوسی کے قول کے مطابق اسی بادشاہ کے عہد میں سب سے

پہلے آگ دریافت ہوئی جو دو پتھروں کی رگڑ سے پیدا ہوتی تھی۔ اسی بادشاہ کے زمانے سے ایران میں آتش پرستی کی ابتدا ہوئی۔

ہوشنگ کے بعد تہمورس اور اس کے بعد جمشید تخت نشین ہوا۔ "جام جم" جس سے شعرا اپنے کلام کو زینت بخشتے ہیں اسی بادشاہ کے عہد میں تیار کیا گیا۔ اسی کے زمانہ سے جشنِ نوروز کی ابتدا ہوئی شرابِ انگور بھی اسی کے زمانہ میں ایجاد ہوئی۔

جمشید کے آخری زمانے میں ایک شخص ضحاک نے بغاوت کی اور جمشید کو پکڑ کر آرے سے چیر کر مروا ڈالا اور خود تخت پر بیٹھ گیا لیکن وہ بڑا ظالم تھا رعایا اس کے ظلم سے تنگ آ گئی اُسے تخت سے اُتار کر جمشید کے پوتے فریدوں کو اپنا بادشاہ بنالیا اسی بادشاہ کے عہد میں کاوہ آہنگر نے ایران کا مشہور جھنڈا (درفش کاویانی) بنایا۔ ایران میں سب سے پہلا آتشکدہ اسی بادشاہ کے عہد میں تیار ہوا۔ اور یہی بادشاہ مرزا غالب کا جدِ اعلیٰ تھا۔

اس کے بعد کیانیوں کا عروج ہوا حکمراں خاندان کے معزز لوگ وطن چھوڑ کر ادھر اُدھر منتشر ہو گئے اِن کے بعض افراد نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرلی۔ جو سلجوقی سلطنت کے نام سے مشہور ہے جس کے بادشاہوں میں الپ ارسلاں۔ ملک شاہ اور سنجر بہت مشہور ہیں۔

جب اس سلطنت کو بھی زوال آگیا تو اس خاندان کے افراد پھر منتشر اور پراگندہ ہو گئے ان ہی میں ایک شہزادہ ترسم خاں تھا جس نے

سمرقند میں اقامت اختیار کی یہی شخص مرزا غالب کا پر دادا تھا۔

مرزا غالب کے دادا قوقان بیگ خاں کسی بات پر اپنے باپ سے ناراض ہو کر شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے ہندوستان چلے آئے۔ ان کی زبان ترکی تھی ہندوستان کی کوئی زبان نہیں جانتے تھے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ملازمت ملنے میں دقت نہیں ہوئی وہ پہلے لاہور میں نواب معین الملک کے پاس ملازم ہوئے اِن کی وفات کے بعد نواب ذوالفقار الدولہ کی وساطت سے شاہ عالم کی حکومت میں ان کو پچاس سوار نقارہ اور نشان کے ساتھ ملازمت مل گئی اور پرگنہ پہاسوان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے مقرر ہوا اور اُنھوں نے مستقل طور پر دہلی میں اقامت اختیار کر لی۔

قوقان بیگ کی سات اولادیں تھیں چار بیٹے اور تین لڑکیاں چار بیٹوں میں سے ایک کا نام نصر اللہ خاں تھا۔ اور ایک کا نام مرزا عبداللہ بیگ اور یہی مرزا عبداللہ بیگ خاں مرزا غالب کے والد بزرگوار ہیں۔

مرزا عبداللہ بیگ خاں

یہ دہلی میں پیدا ہوئے جب تک ان کے والد قوقان بیگ خاں زندہ رہے بڑے آرام سے زندگی بسر کرتے رہے اِن کی شادی خواجہ مرزا غلام حسین خاں کی صاحبزادی عشرت النساء بیگم سے ہوئی تھی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان ایک فوجی افسر تھے اور آگرہ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آگرہ میں ان کی کافی جائیداد تھی مرزا عبداللہ بیگ خاں

اپنی سسرال میں مرزا دولھا کے نام سے مشہور تھے۔

جب ان کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ تو انھیں اپنے روزگار کی فکر ہوئی اس لئے کہ پہاسو کی جاگیر جاتی رہی وہ باپ کی زندگی تک کے لئے تھی لہذا انھیں ملازمت کے لئے ادھر اُدھر جانا پڑا پہلے وہ لکھنؤ میں جا کر نواب آصف الدولہ کے یہاں ملازم ہوتے پھر کچھ عرصہ کے بعد حیدر آباد میں نواب نظام علی خاں کے یہاں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں وہ تین سو سواروں کے افسر رہے وہ وہاں کئی برس تک رہے لیکن یہ ملازمت بھی حیدر آباد کے خانہ جنگی کے جھگڑے میں جاتی رہی۔

اس کے بعد انھوں نے الور کا قصد کیا اس وقت راجہ بختاور سنگھ حکمراں تھے اتفاق سے ایک گڑھی کے زمینداروں نے راجہ سے بغاوت کی۔ جو فوج باغیوں کو دبانے کے لئے بھیجی گئی اس میں مرزا عبداللہ بیگ خاں بھی تھے ان کے گولی لگی اور انکا انتقال ہو گیا اور راج گڑھ میں مدفون ہوئے۔

مرزا غالب کی ولادت

مرزا غالب ۲۷ ر دسمبر ۱۷۹۷ء مطابق ۸ ر رجب ۱۲۱۲ھ میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام اسداللہ بیگ خاں تھا لیکن ان کو عام طور سے مرزا نوشہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

مرزا غالب ابھی پانچ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں کا الور میں انتقال ہو گیا تو ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے بچوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور چونکہ ان کے کوئی اولاد نہ تھی اس لئے ان کی اپنے حقیقی بچوں کی طرح پرورش کی
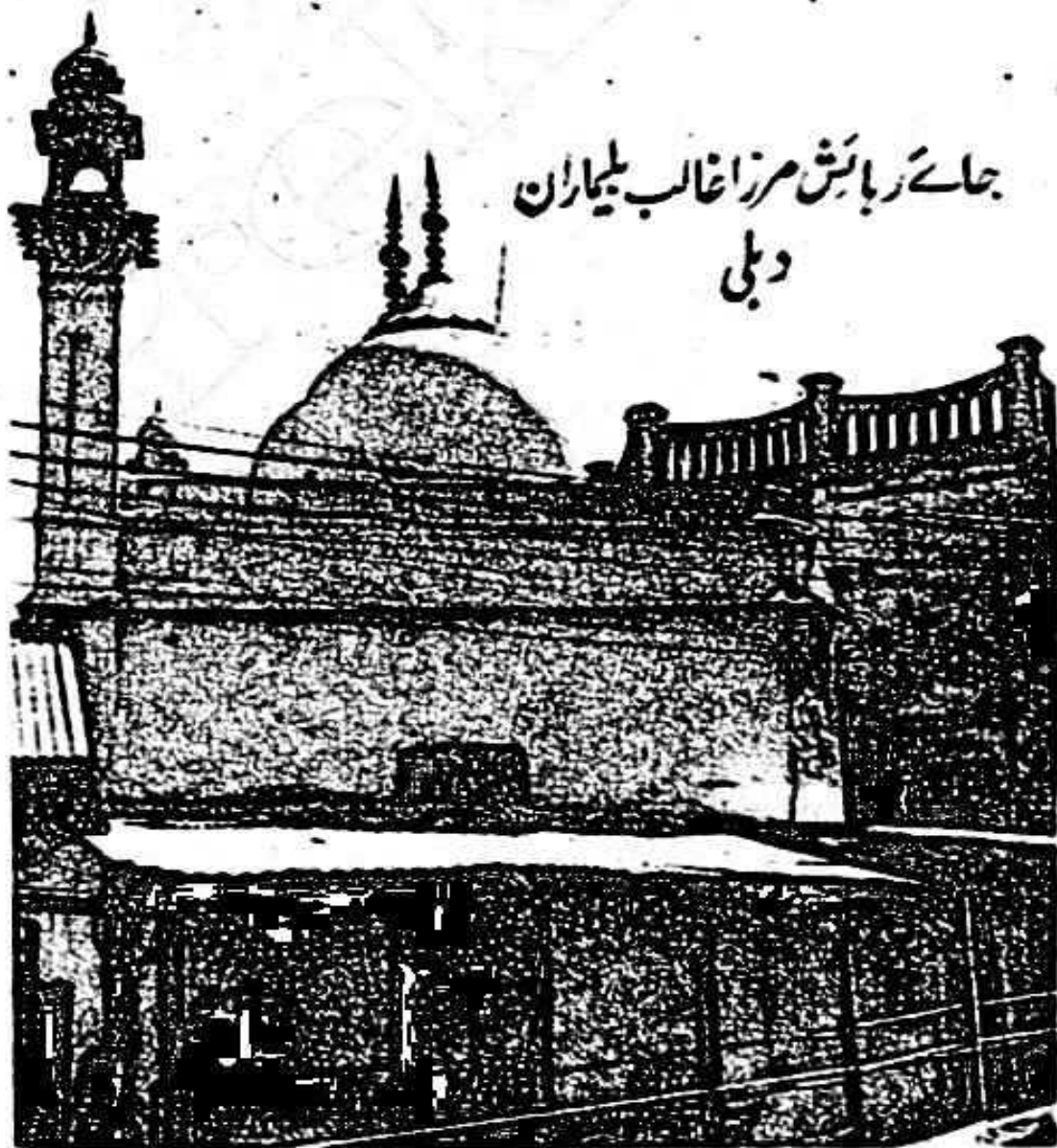
مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے

مرزا نصر اللہ بیگ خاں

مرزا نصر اللہ بیگ خاں مرزا غالبؔ کے چچا انگریزی عملداری سے پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد (آگرہ) کے صوبہ دار تھے ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے چڑھائی کی تو مرزا نصر اللہ بیگ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور بغیر لڑے بھڑے شہر کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا اس کا انگریزوں پر اچھا اثر ہوا پھر نواب احمد بخش صاحب نے بھی ان کی سفارش کی۔ غرضیکہ مرزا نصر اللہ بیگ کو انگریزی فوج میں چار سو سواروں کا رسالدار بنا دیا گیا۔ اور سترہ سو روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے سونک اور سونسا کے دو زرخیز پرگنے جو بھرت پور کے قریب تھے ریاست ہلکر کے سپاہیوں سے چھین لئے اور ان پر قبضہ جمالیا۔ جنرل لیک کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے یہ دونوں پرگنے بھی خوش ہو کر مرزا صاحب کو تاحیات خرچ کے لئے جاگیر میں دیدیئے۔ اس واقعہ کے سال بھر بعد ایک لڑائی میں ہاتھی سے گر کر فوت ہو گئے مرزا غالبؔ کی عمر اس وقت آٹھ برس کی تھی ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف بھی تھے۔

مرزا کے سرپرستوں نے لارڈ لیک سے سفارش کی اور بتایا کہ نصر اللہ بیگ نے گورنمنٹ کی زبردست خدمت انجام دی ہے لہٰذا اس کے صلے میں ان بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے لارڈ لیک نے ان کی سفارش پر کچھ پنشن کا انتظام کر دیا اس کے علاوہ کچھ رقم الور سے

سے بھی بطور امداد ملتی تھی اس سے مرزا کا بچپن اور طفلی کا زمانہ نہایت عیش و آرام سے گزرا۔

مرزا کی ننھیال! جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان تھے جو فوجی افسر تھے اور آگرہ کے رئیسوں میں سے تھے۔ ان کے پاس کافی جائیداد اور دولت تھی اس کا کچھ اندازہ مرزا غالب کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے منشی شیو نراین کو لکھا تھا۔ فرماتے ہیں :۔

"تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا کیا حال معلوم ہے مجھ سے سنو تمہارے دادا کے والد عہد نجف خاں میں میرے نانا صاحب خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے۔ تو تمہارے پردادا نے بھی کمر کھول دی اور پھر کہیں نوکری نہ کی یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی بنسی دھر و منشی شیو نراین کے دادا خان صاحب (خواجہ غلام حسین) کے ساتھ ہیں اور انھوں نے جو کھیتم گاؤں میں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں وکالت اور مختاری کرتے ہیں اور وہ (منشی بنسی دھر) میرے ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں انیس برس کی میری عمر ایسی ہی ان کی عمر باہم شطرنج اور اختلاط اور صحبت آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔

چونکہ گھران کا بہت زور نہ تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے بس ہمارے اور ان کے مکان میں چھپیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے ہماری بڑی حویلی وہ ہے جو اب سیٹھ لکھمی چند نے مول لے لی ہے اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس ایک کھٹیا والی اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک اور کٹرہ گڈریوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹرہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا۔ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ واصل خاں ایک سپاہی تمہارے دادا کا پیش دست رہتا تھا اور کٹروں کا کرایہ اگاہ کران کے پاس جمع کراتا تھا سنو تو سہی تمہارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔ علاقے مول لئے تھے۔ اور زمینداری اپنا کر لیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکاری مالگذاری ادا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے مرزا کے چچا نواب احمد بخش صاحب خاں کی ہمشیرہ سے منسوب تھے جو خود بھی بہت دولت مند تھے۔ لہذا مرزا کا بچپن اور عہد طفلی بڑے ناز و نعم اور عیش کے ساتھ گزرا

مرزا کی تعلیم

والد اور چچا کی وفات کے بعد مرزا اپنی ننھیال میں رہنے لگے یہ بہت خوش حال لوگ تھے انھوں نے

اپنی حیثیت کے مطابق مرزا کی تعلیم و تربیت میں کوشش کی اس زمانے میں آگرہ میں مولوی محمد معظم صاحب ایک مشہور اور قابل اُستاد تھے۔ مرزا نے فارسی کی ابتدائی تعلیم انھیں سے حاصل کی اس کے علاوہ ان کی والدہ بھی تعلیم یافتہ تھیں اور وہ بھی مرزا کی تعلیم کا پورا پورا خیال رکھتی تھیں۔

اسی زمانہ میں ایران کے رہنے والے ایک شخص ملا عبدالصمد سیاحتہً آگرہ وارد ہوئے۔ یہ پہلے پارسی تھے ان کا نام ہرمزد تھا لیکن اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گئے۔ وہ فارسی کے زبردست عالم تھے اور عربی سے بھی واقف تھے۔ اتفاق سے ان کی مرزا سے ملاقات ہو گئی اس وقت مرزا کی عمر ۱۴ سال تھی۔ مرزا کی شاعری۔ ذہانت اور ذکاوت دیکھ کر وہ حیران رہ گئے مرزا کو بھی ان سے عقیدت ہو گئی اور انھیں اپنے گھر لائے اور دو سال تک ان سے فارسی پڑھی ملا عبدالصمد نے مرزا کو پارسی مذہب اور عقائد کے متعلق تمام باتیں سمجھائیں مرزا کا حافظہ بلا کا تھا دو سال میں کافی فارسی پڑھ لی۔ بلکہ فارسی میں انھیں وہ ملکہ ہو گیا جو اہل زبان ہی کا حصّہ ہے غالب کی فارسی کی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فارسی کے اصول و قواعد اور صرف و نحو سے اچھی طرح واقف تھے فارسی کی تمام قدیمی کتابیں اور اساتذہ کا کلام ان کی نظر سے گزر چکا تھا۔

شاعری کی ابتدا

مرزا نے دس گیارہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور پچیس برس کی عمر تک تقریباً دو ہزار

اشعار کا دیوان تباہ ہو گیا ان اشعار میں غالب نے بیدل اور اسیر کی پیروی کی اس لئے ان کا ابتدائی کلام پیچیدہ اور فارسی کی ترکیبوں سے بھرپور ہے۔

میر تقی میر کی وفات کے وقت مرزا کی عمر ۱۳ سال کی تھی کسی نے مرزا غالب کے اشعار انھیں سنائے تو انھوں نے فرمایا :-

"اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو وہ لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگا۔"

لیکن مرزا اسد فیاض کے یہاں سے غیر معمولی ذہانت، اہلیت اور شاعرانہ دماغ لے کر آئے تھے انھوں نے شاعری میں کسی کو استاد نہ بنایا۔ بلکہ اساتذہ متقدمین و متاخرین کا اردو اور فارسی کا کلام دیکھ کر خود ہی شاعری کرنے لگے۔

شادی

۱۹ اگست ۱۸۱۰ء کو تیرہ برس کی عمر میں مرزا کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دختر امراؤ بیگم سے ہو گئی۔ شادی کے وقت امراؤ بیگم کی عمر ۱۱ سال تھی نواب الٰہی بخش معروف نواب احمد بخش خاں بہادر والی فیروز پور جھرکہ کے چھوٹے بھائی تھے انھوں نے تمام عمر گوشہ نشینی اور عبادت میں گزار دی یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ ۱۸۲۶ء میں ان کا انتقال ہوا اور خواجہ نظام الدین اولیا کے مقبرہ کے قریب ہی دفن ہوئے۔

مرزا کا قیام دہلی

دہلی میں مرزا اپنے خاندان سے الگ تھلگ کرائے کے مکان میں آکر رہے اور دہلی کے مہذب اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت جلد روشناس ہو گئے۔ اور ان کی بے مثال شاعری نے بہت جلد سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہاں ان کی ملاقات مولوی فضل حق خیرآبادی سے ہوئی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ مولانا فضل صاحب شاعری کا بہت سخن اور اعلیٰ مذاق رکھتے تھے اُنھوں نے غالب کو مشورہ دیا کہ اپنی موجودہ روش کو چھوڑ کر آسان روش اختیار کریں غالب کے دل میں ان کی بڑی عزت اور وقعت تھی۔ چنانچہ ان ہی کے مشورے سے انھوں نے اپنے دیوان سے بہت سے پیچیدہ اور مشکل اشعار نکال دیئے۔ اور موجودہ دیوان مرتب کیا۔ جو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہے یہی وجہ ہے کہ بعض غزلوں میں ایک یا دو شعر ہی ملتے ہیں۔

پنشن کا قضیہ

مرزا کے چچا نصراللہ بیگ کی وفات کے بعد لارڈ لیک نے ان کے عزیزوں کی پرورش کے لئے کچھ پنشن کا انتظام کرایا اور وہ اس طرح کہ نواب احمد بخش کو حکومت کی خدمات کے سلسلہ میں سرکار انگریزی کی طرف سے میوات میں فیروزپور جھرکہ اور مضافات ہوڈل تحصیل فیروزپور جھرکہ میں نگینہ اور پونا ہانہ وغیرہ کی جاگیر ملی تھی لیکن اس شرط پر کہ نواب احمد بخش انگریزی سرکار کو

پچیس ہزار روپے سالانہ ادا کرتے رہیں گے لیکن نصراللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان کے پس ماندگان کی امداد کے لئے حکومت کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا کہ نواب احمد بخش خاں اپنی جاگیر کے سلسلہ میں جو پچیس ہزار روپے سالانہ دیتے ہیں وہ اس شرط پر معاف کئے جاتے ہیں کہ پندرہ ہزار تو وہ اپنے فوجی دستے کی غور پرداخت پر صرف کریں اور باقی دس ہزار وہ مرزا مرحوم کے خاندان کو بطور پنشن ادا کیا کریں۔

لیکن اس فیصلہ کے کچھ ہی عرصہ بعد کوشش کر کے نواب احمد بخش نے ایک دوسرا حکم حاصل کر لیا کہ مرزا نصراللہ بیگ کے متعلقین کو بجائے دس ہزار کے صرف پانچ ہزار روپے بہ تفصیل ذیل ادا کئے جائیں۔

(۱) خواجہ حاجی .... دو ہزار روپے سالانہ۔

(۲) مرزا نصراللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنیں.... ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ۔

(۳) مرزا نوشہ اور مرزا یوسف برادر زادگان مرزا نصراللہ بیگ خاں مرحوم ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ۔

اس حکم کے مطابق مرزا کو ساڑھے سات سو روپے سالانہ ایک عرصۂ دراز تک ملتے رہے۔

خواجہ حاجی۔ نصراللہ بیگ خاں کے متعلق یا پسماندگان میں سے نہ تھے ان کو دو ہزار روپے سالانہ کی پنشن مرزا غالب کو بڑی شاق گزرتی تھی۔ اسے وہ اپنے خاندان کی حق تلفی شمار کرتے تھے اور سمجھتے تھے خواجہ حاجی کی وفات کے بعد یہ رقم ہمارے خاندان میں تقسیم کر دی جائے گی۔

لیکن ایسا نہ ہوا خواجہ حاجی کی وفات کے بعد ان کے دونوں بیٹوں شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدرالدین خاں عرف خواجہ زبانی (مترجم بوستان خیال) کے درمیان تقسیم کی گئی۔ مرزا نے اس تقسیم پر ناراضگی کا اظہار کیا اور لوگوں سے شکایت بھی کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

مرزا کو نواب احمد بخش کے دوسرے شقہ کا علم نہیں تھا وہ سمجھتے تھے کہ مئی ۱۸۰۶ء کے فیصلہ کے مطابق ان کے خاندان اور ان کو دس ہزار روپیہ سالانہ ملنا چاہیئے اب تک جو پنشن ان کو ملتی تھی اس کے متعلق اس لئے لب کشائی نہ کرتے تھے کہ نواب احمد بخش صاحب یوں بھی کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے۔

نواب احمد بخش کی اولاد میں جائیداد کے لئے کشمکش

نواب احمد بخش خاں صاحب نے ۱۸۲۲ء میں اپنی جائیداد کی تقسیم اس طرح کی کہ فیروز پور جھرکہ کی ریاست اپنے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کے نام کردی۔ جو میواتی بیوی بہو خانم سے پیدا ہوئے تھے اور لوہارو کی جاگیر کا وارث اپنی بیوی بیگم جان کے بیٹوں امین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو بنایا اور اپنی زندگی ہی میں اپنی جائیداد تقسیم کر کے خود گوشہ نشینی اختیار کرلی۔

نواب احمد بخش کی وفات کے بعد نواب شمس الدین احمد خاں نے یہ دعویٰ دائر کردیا کہ لوہارو کا پرگنہ بھی میرے حوالہ کیا جائے اور بھائیوں

کی پنشن مقرر ہوا اس لئے کہ وہ ابھی نابالغ ہیں اور انتظام کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ مقدمہ دہلی کے انگریزی ریزیڈنٹ کے پاس پہونچا اس نے یہ سفارش کی کہ پرگنہ لوہارو امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں ہی کے پاس رہے شمس الدین کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہ ہونا چاہیے جاگیر کے مصارف اور انتظامی اخراجات کے بعد جو کچھ بچے اس کا نصف حصہ ضیاء الدین احمد خاں کے نابالغی کے زمانے تک سرکاری خزانہ میں ان کے نام سے جمع ہوتا رہے جب وہ بالغ ہو جائیں تو روپیہ ان کو دیدیا جائے۔ اور لوہارو کا پرگنہ دونوں بھائیوں میں برابر سے تقسیم کر دیا جائے۔

یہ فیصلہ تینوں کو سنا دیا گیا اور انھوں نے منظور کر لیا ریزیڈنٹ نے اس فیصلہ کو منظوری کے لئے حکومت ہند کے پاس بھیج دیا حکومت ہند نے اس فیصلہ کو منظور کر لیا لیکن یہ تجویز بھی پیش کی کہ لوہارو کو تقسیم کرنا مناسب نہیں نابالغی کے زمانے تک جاگیر کا انتظام شمس الدین احمد خاں کی نگرانی میں دیدیا جائے آخر کار شمس الدین خاں کے بیحد اصرار پر لوہارو کا انتظام ان کے حوالہ کر دیا گیا۔

۱۸۳۲ء میں ولیم فریزر دہلی کے ایجنٹ مقرر ہو کر آئے ان کے نواب احمد بخش صاحب سے دوستانہ تعلقات تھے امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں کی شکایت پر انھوں نے تجویز پیش کی کہ نواب احمد بخش کی تقسیم کے مطابق لوہارو ان کے دونوں بیٹوں کو ملنا چاہیئے چنانچہ ان کے مشورہ سے دونوں بھائی کلکتے گئے تاکہ گورنر جنرل کے

یہاں اپنا مقدمہ پیش کریں کلکتہ میں اُنھوں نے اپنے تمام حالات اعلیٰ حکام کو سُنائے چنانچہ فیصلہ ان کے حق میں ہوا اور لوہارو کی جائیداد کا وارث ان دونوں بھائیوں کو تسلیم کیا گیا۔

اس فیصلہ سے نواب شمس الدین خاں کو بہت رنج ہوا قبضہ میں آئی ہوئی جائیداد ہاتھ سے نکل گئی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ اسکیم بنائی کہ کسی طرح فریزر کو قتل کر دیا جائے تاکہ ان کے سوتیلے بھائیوں کا کوئی ہمدرد نہ رہے اس کام کو انجام دینے کے لئے اس نے اپنے دو آدمیوں کریم خاں اور انیا کو مقرر کیا۔ کہ جب بھی موقعہ پائیں فریزر کو قتل کر دیں۔

آخر ایک دن کریم خاں نے موقعہ پاکر گولی سے فریزر کو ہلاک کر دیا اور خود بچکر نکل گیا ہر جگہ قاتل کی تلاش ہونے لگی فریزر اور نواب شمس الدین خاں کے تعلقات اچھے نہ تھے اور نواب صاحب فریزر کو اکثر بُرے الفاظ سے یاد کیا کرتے تھے تو بعض لوگوں کو یہ شک پیدا ہو گیا کہ ممکن ہے کہ یہ فعل نواب صاحب کی سازش سے ہوا ہو۔

اس قتل کی تفتیش کے لئے حکومت نے جان لارنس کو مقرر کیا۔

جان لارنس کو مختلف شہادتوں اور ثبوتوں کی بنا پر یقین ہو گیا کہ نواب شمس الدین خاں اس سازش میں ضرور شریک ہیں چنانچہ ان کے گھر کی تلاشی لی گئی کچھ قابل اعتراض چیزیں برآمد ہوئیں ان کے ملازم وسائل خاں کو گرفتار کر لیا گیا اور نواب صاحب کو پیغام بھیجکر دہلی طلب کیا گیا۔

نواب صاحب اپنے تعلقات کی بنا پر یہ سمجھتے تھے کہ ان کا بال بیکا نہ ہوگا اگرچہ لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ نہ جائیں اور کہیں روپوش ہوجائیں لیکن نواب کی غیرت نے یہ بات گوارا نہ کی وہ ہتھیار لگائے نہایت شان کے ساتھ ریزیڈنٹ کے پاس پہونچے یہاں ان کے لئے پہلے ہی سے انتظام کیا گیا تھا پہلے ان سے ہتھیار چھین لئے گئے پھر گرفتار کر کے ان کو نظر بند کر دیا گیا۔ کریم خاں اور انیا بھی گرفتار ہو گئے مقدمہ چلا اور دونوں ملازموں نے سازش کا راز افشا کر دیا اور کریم خاں نے اپنا قصور تسلیم کر لیا شمس الدین بھی مجرم قرار دیدئے گئے پہلے کریم خاں کو پھانسی دی گئی پھر اکتوبر ۱۸۳۵ء میں کشمیری دروازہ کے باہر نواب شمس الدین احمد خاں کو بھی پھانسی دیدی گئی۔ اور ان کی میت کو قدم شریف میں دفن کیا گیا اور ان کی ریاست فیروز پور جھرکہ حکومت نے ضبط کر لی۔

مرزا غالب کے خاندان کی پنشن بھی نواب شمس الدین ہی کے ذمہ ہو گئی تھی نواب شمس الدین کی نیت اچھی نہیں تھی وہ مرزا کو اتنی قلیل پنشن دینے میں بھی تساہل سے کام لیتے تھے آخر ۱۸۳۱ء میں پنشن بالکل بند کر دی گئی جو چار سال تک یعنی نواب شمس الدین کی گرفتاری تک بند رہی یہ زمانہ مرزا کے لئے بڑا صبر آزما تھا آمدنی کی کمی، اخراجات کی تنگی، مفلسی، اور بھائی کی دیوانگی نے مرزا کو بہت پریشان کر دیا۔ پہلے تو انھوں نے نواب کی خدمت میں حاضر ہو کر معاملات کو سلجھانے کی کوشش

کی لیکن جب نواب شمس الدین نے کوئی بات نہ مانی تو انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ ان کے اور ان کے خاندان والوں کے ساتھ جو بے انصافی کی گئی ہے اس سے اعلیٰ حکام کو مطلع کریں اور اپنے حق کے لئے جنگ کریں اور مرافعہ پیش کرنے کے لئے گورنر جنرل کی خدمت میں کلکتہ جائیں ۔"

سفرِ کلکتہ

مرزا غالب یہ سمجھتے تھے کہ جو پنشن انھیں فیروز پور جھرکہ کی طرف سے ملتی ہے وہ مقررہ رقم سے بہت ہی کم ہے ان کے خاندان والوں کو بجائے تین ہزار کے دس ہزار ملنے چاہئیں ۔

چنانچہ قانونی چارہ جوئی کرنے اور اپنا مرافعہ گورنر جنرل کے سامنے پیش کرنے کے لئے مرزا ۱۸۲۷ء میں کلکتہ روانہ ہوئے ۔ اس وقت مرزا کی عمر تقریباً ۳۰ سال تھی لکھنؤ کے بعض احباب اور وہ معزز حضرات جنھوں نے مرزا کی شاعری کی شہرت سُنی تھی چاہتے تھے کہ مرزا کبھی لکھنؤ ضرور تشریف لائیں اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور براستہ کانپور لکھنؤ پہنچ گئے وہاں اہل لکھنؤ نے مرزا کی بہت اچھی طرح خاطر مدارات کی اس زمانے میں نصیر الدین حیدر لکھنؤ کے بادشاہ تھے اور روشن الدولہ امین السلطنت تھے نائب السلطنت نے مرزا کی شہرت سُن کر ان کو ملاقات

کے لئے اپنے یہاں بلایا۔ لیکن مرزا نے دو شرطیں پیش کیں۔
(۱) نائبُ السلطنت میرا استقبال کریں اور (۲) مجھے نذر دینے سے معاف کیا جائے چونکہ نائبُ السلطنت نے دونوں شرطیں نامنظور کیں اس لئے ملاقات نہ ہوگی۔

آخر کار ۲۷ر جون ۱۸۲۷ء کو مرزا لکھنؤ سے روانہ ہو گئے ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں غازی الدین حیدر شاہ کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے سات آٹھ سال بعد جب روشن الدولہ نائب السلطنت مقرر ہوئے تو منشی محمد حسن اور روشن الدولہ کی وساطت سے مرزا غالب کا قصیدہ بادشاہ کے دربار میں پڑھا گیا اور بادشاہ کی طرف سے اس پر پانچ ہزار روپے انعام کا حکم ہوا بقول ناسخ تین ہزار تو روشن الدولہ کھا گئے دو ہزار منشی محمد حسن نے رکھ لئے۔ اور غالب کو ایک پیسہ بھی نہ ملا۔

مرزا لکھنؤ سے بنارس آئے یہ شہر انھیں بہت پسند آیا وہاں سے گھوڑے پر سوار ہو کر پٹنہ اور مرشد آباد روانہ ہوئے۔ ۲۰ر فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچ گئے؛ اور شملہ بازار میں ایک اچھا مکان دس روپے ماہوار کرائے پر لیکر اس میں اقامت اختیار کی۔

کلکتہ میں مرزا کو خبر ملی کہ نواب احمد بخش صاحب جن کی تقسیم کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کے لئے وہ کلکتہ آئے تھے۔ فوت ہو گئے انھوں نے جائیداد کا وارث نواب شمس الدین کو قرار دیا تھا اور اب مرزا کا تنازعہ انھیں سے تھا۔

آخر کار مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ کی مدد سے مرزا نے اپنا مرافعہ گورنر جنرل کی
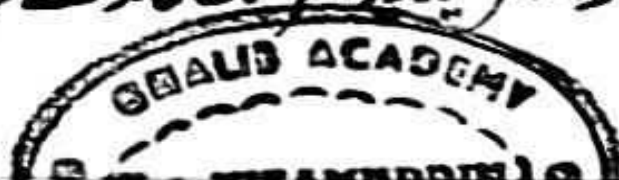
کونسل میں پیش کیا۔ مرزا کے مطالبات یہ تھے ۔

(۱) جو مقدار پنشن سرکار نے مقرر کی ہے وہ ان کے خیال کے مطابق کم ہے وہ آئندہ پوری ملا کرے ۔

(۲) جس قدر کم پنشن ملتی رہی ہے وہ ابتدا سے آج تک ریاست فیروز پور جھرکہ سے دلائی جائے ۔

(۳) کل پنشن میں جو میرا حصہ قرار پائے وہ مجھے علیحدہ دیا جائے ۔

(۴) یہ پنشن فیروز پور خزانہ سرکار میں منتقل ہو جائے تاکہ رئیس فیروز پور سے نہ مانگنی پڑے ۔

(۵) خطاب اور خلعت دیا جائے ۔

گورنر جنرل کے دفتر سے یہ حکم ہوا کہ پہلے یہ درخواست ایجنٹ دہلی کے پاس جانا چاہیے وہ کوئی سفارش کریں گے تو اس پر غور کیا جائے گا۔

چنانچہ مرزا خود کلکتہ میں رک گئے اور اپنے وکیل ہیرا لال کی معرفت سر اڈورڈ کول برگ ایجنٹ دہلی کی خدمت میں درخواست بھیجی کول برگ نے مرزا کے حق رپورٹ کی اس اثناء میں کول برگ کا انتقال ہو گیا۔ اور نئے سرے سے تفتیش شروع ہوئی ۔

اب کلکتہ کے قیام سے کوئی فائدہ نہ تھا اس لئے مرزا ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو کلکتہ سے دہلی آگئے ۔ ہال بیچ کر نئے ایجنٹ فرانسیس ہاکنس سے مدد چاہی ہاکنس کے نواب شمس الدین سے دوستانہ تعلقات تھے انھوں نے جو رپورٹ پیش کی وہ شمس الدین کے حق میں تھی ابھی یہ رپورٹ کلکتہ پہونچی بھی نہ تھی کہ

اسٹرلنگ مر گیا اور کلکتہ میں مرزا کی سفارش کرنے والا کوئی نہ رہا۔

آخر کار لارڈ ولیم بنٹنگ نے مرزا کے خلاف فیصلہ دیا البتہ ان کی درخواست نمبر ۳ و نمبر ۴ منظور کر لی گئیں پانچویں بھی نامنظور ہو گئی۔ لیکن جب کبھی دلی میں وائسرائے یا لفٹیننٹ بہادر کا دربار ہوتا تو ان کو بھی مثل دیگر رؤسا کے بلایا جاتا اور سات پارچے کا خلعت معہ جیغہ سرپیچ و مالائے مروارید مرزا کو دیا جاتا۔

کلکتہ کا قیام

شہر کلکتہ مرزا کو بہت پسند آیا اپنے دوستوں کو جو خطوط لکھے ان میں کلکتہ کی بہت تعریف لکھی ہے مرزا دو سال تک کلکتہ میں رہے وہاں کی آب و ہوا انھیں بہت راس آئی۔ اسی دوران میں اکثر ادیب اور اہل قلم مرزا کے دوست بن گئے۔

نواب اکبر علی طباطبائی جو امام باڑہ ہوگلی کے متولی تھے مرزا نے ایک خط میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ایسا عالی پایہ اور صاحب دل امیر بنگال میں نہ ہوگا"

مولوی سراج الدین احمد قصبہ موہان کے رہنے والے تھے جو بغرض کاروبار کلکتہ میں قیام پذیر تھے ان کے مرزا سے بہت گہرے تعلقات ہو گئے تھے ان کے متعلق لکھتے ہیں:-

ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے دو مخلص صادق الاولاد دیکھے ایک مولوی سراج الدین اور دوسرے منشی غلام غوث خاں۔

مرزا غالب نے اپنے منتخب اردو فارسی اشعار کا مجموعہ جو "گل رعنا"

کے نام سے مرتب کیا تھا وہ مولوی سراج ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

کلکتہ کے ادبی ہنگامے

جس زمانے میں مرزا کلکتہ پہنچے ہر انگریزی مہینہ کی پہلے اتوار کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے قائم کیۓ ہوئے مدرسہ کلکتہ میں ایک مشاعرہ ہوتا تھا جس میں فارسی اور اُردو کے شعرا اپنا کلام سُناتے تھے غالب کے ۱۸۲۸ء میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مرزا نے ایک فارسی کی غزل پڑھی اس پر بعض لوگوں نے مرزا کے بعض الفاظ اور محاوروں پر اعتراض کیۓ۔ اور اپنے اعتراضات کے جواز میں فارسی کے مشہور شاعر قتیل کے اقوال سنداً پیش کیۓ مگر مرزا ہندوستان کے فارسی شاعروں میں سوائے خسرو کے کسی کو نہیں مانتے تھے انھوں نے ناک بھوں چڑھا کر کہا "میں فرید آباد کے کھتری بچے کے قول کو نہیں مانتا" اس پر معترضین میں اور زیادہ جوش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراضوں کی بوچھاڑ ہونے لگی

مرزا نے اس مخالفت سے گھبرا کر فارسی میں ایک مثنوی "باد مخالف" کے نام سے لکھی جس میں پہلے تو اپنے مصائب اور پریشانیوں کا حال لکھا اور لکھا کہ میں انصاف حاصل کرنے کے لئے اس شہر میں آیا ہوں مجھے چند روز آرام سے رہنے دیجئے۔ اور مہمان نوازی کا حق ادا کیجئے مجھے کسی سے بھی پرخاش نہیں ہے میں نے جو کچھ لکھا ہے اہل زبان کے الفاظ اور محاوروں کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ اہل زبان اسی طرح لکھتے ہیں اس مثنوی میں مرزا نے معترضین کے اعتراضات کا جواب بھی دیا لیکن

حاسدوں اور مفسدوں نے کوئی بات نہ سُنی اور مرزا کی آخر تک مخالفت کرتے رہے۔

نواب امین الدین خاں سے تعلقات

مقدمہ کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد مرزا کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی اس مقدمہ کے اخراجات کے لئے اس اُمید پر لوگ قرض دیتے رہے تھے کہ انھیں اُمید تھی کہ مرزا ضرور مقدمہ جیت جائیں گے اور ان کی رقمیں واپس مل جائیں گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ ایسے وقت میں ان کے دوستوں نے ان کی بڑی مدد کی جن میں ایک مولوی فضل حق صاحب تھے دوسرے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور نواب امین الدین اور نواب ضیاء الدین بھی گاہے گاہے مرزا کی مدد کرتے رہتے تھے اس لئے کہ نواب شمس الدین کی مخالفت کی وجہ سے یہ لوگ آپس میں دوست بن گئے چنانچہ جب نواب امین الدین نواب شمس الدین کے خلاف مقدمہ دائر کرنے اور اپنا حق حاصل کرنے کے لئے کلکتہ گئے تو مرزا نے ان کی مدد کی اپنے کلکتہ کے دوستوں کو خطوط لکھے کہ وہ نواب صاحب کی ہر امکانی مدد کریں۔

اسی زمانے میں کسی نے فریزر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا فریزر کے مرزا سے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان کی تعریف میں مرزا نے ایک قصیدہ بھی لکھا تھا۔ فریزر کی موت کا مرزا صاحب کو بہت افسوس ہوا لیکن حکومت ہند کو ثابت ہو گیا کہ فریزر کے قتل میں نواب شمس الدین کی سازش

تھی چنانچہ نواب شمس الدین کو پھانسی ہوگئی اور ان کی جائیداد ضبط ہوگئی اور مرزا کی پنشن جو فیروزپور سے آتی تھی باقاعدہ دہلی کلکٹری سے ملنی شروع ہوگئی۔

مقدمہ کے بعد

مقدمہ کی ناکامی کے بعد مرزا نے مستقل طور پر دہلی میں رہائش اختیار کی۔ ہر شاعری کی محفل میں مرزا عزت کے ساتھ بلائے جاتے اور ان کا کلام نہایت ذوق شوق کے ساتھ سنا جاتا۔ مرزا کو تھوڑا سا سکون ہوا تو انھوں نے فارسی میں ایک کتاب (پنج آہنگ) لکھی جس میں مرزا کے فارسی اشعار اور فارسی خطوط اور فارسی کے متفرق مضامین ہیں۔

یہ کتاب ۱۸۴۲ء میں مرتب ہوئی ان میں فارسی خطوط سے مرزا کی زندگی کے صحیح حالات معلوم ہوتے ہیں اور اس وقت ہندوستان میں جو بڑی بڑی ہستیاں تھیں ان سے تعارف ہوجاتا ہے اس کے علاوہ مرزا نے اردو خطوط نویسی میں جدت کرکے انقلاب پیدا کردیا زمانہ قدیم میں خطوں کی عبارت بہت پیچیدہ مقفیٰ اور مختلف قسم کی صنعتوں سے بھرپور ہوتی تھی مرزا نے اردو خطوط بھی لکھے جو سادگی میں فارسی خطوں سے بڑھ گئے اتنی سادہ زبان میں خطوط لکھے کہ خطوط نویسی میں اردو کو انگریزی زبان کے مدِ مقابل بنادیا صرف خطوط نویسی کا عظیم الشان کارنامہ ہی مرزا کو ایک

عظیم المرتبت شخصیت منوانے کے لئے کافی ہے۔

ان کے تمام خطوط عود ہندی اور اُردوئے معلّیٰ کتابوں میں چھپ چکے ہیں انھیں خطوط سے مرزا کے ذاتی اور خاندانی حالات غدر ۱۸۵۷ء کی تباہی ان کی عادات واخلاق اور دوستوں سے برتاؤ کے سلسلہ میں صحیح معلومات ہوتی ہیں۔

ان کی جو کتابیں ان کے سامنے شائع ہوئی ہیں ان سے ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور مرزا بحیثیت ایک مصنّف اور اعلیٰ پایہ کے شاعر کے تمام ہندوستان میں روشناس ہو گئے۔ اور شعر وسخن میں مسلّم الثبوت اُستاد تسلیم کئے جانے لگے۔

اسی شہرت سے متاثر ہو کر مسٹر ٹامس (سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا) ۱۸۴۲ء میں مرزا کو دلی کالج میں فارسی کی پروفیسری کے لئے بلایا۔ مرزا حسب دستور ایک ہوادار میں بیٹھ کر مسٹر ٹامس کے پاس پہونچے اور انتظار کرتے رہے کہ سکریٹری صاحب ان کا استقبال کرنے کے لئے تشریف لائیں۔ سکریٹری صاحب کو مرزا کے آنے کی خبر تو مل گئی لیکن وہ مرزا کو لینے نہیں آئے۔ جب دیر تک مرزا ان کے پاس نہیں آئے تو انھوں نے چپراسی کو بھیج کر اندر ان کے پاس نہ آنے کا سبب دریافت کیا مرزا نے کہلا بھیجا کہ چونکہ آپ مجھے لینے کے لئے باہر تشریف نہیں لائے۔ اس لئے میں بھی اندر نہیں گیا۔

اس بات کو سنکر صاحب باہر تشریف لائے اور مرزا سے کہا کہ جب

آپ گورنری دربار میں بحیثیت ایک رئیس کے تشریف لائیں گے تو ہم آپ کا استقبال کریں گے لیکن اس وقت آپ ملازمت کے لئے آئے ہیں ایسی حالت میں آپ کا وہ استقبال نہیں ہو سکتا۔

مرزا نے کہا میں سرکاری ملازمت اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ خاندانی اعزاز بڑھے اس لئے نہیں کہ رہی سہی عزت بھی چلی جائے اس لئے ایسی ملازمت کو دور ہی سے سلام ہے۔

صاحب نے فرمایا ہم اس کالج کے قاعدے اور قانون سے مجبور ہیں اس پر مرزا نے جانے کی اجازت طلب کی اور واپس چلے آئے۔ اور اپنی شانِ خودداری کو قائم رکھا۔

انگریزوں اور رئیسوں کی تعریف میں جو قصیدے لکھے ہیں۔ وہ ان کی شاعری ہے منظوم درخواستیں ہیں شاعرانہ مبالغے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔

قید کا واقعہ

مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کا بہت شوق تھا جب بھی انھیں شاعری سے فرصت ملتی دماغ کی تفریح اور یکسوئی کے لئے وہ ان میں سے کوئی کھیل ضرور کھیلتے تھے کبھی کبھی بازی بدکر بھی کھیل لیتے تھے چنانچہ اسی چوسر کے کھیل کی بدولت ۱۲۶۳ھ میں ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آیا کسی حاسد نے پولیس کو خبر کردی کہ مرزا جوا کھیل رہے ہیں چنانچہ پولیس نے آکر ان کو گرفتار کرلیا۔ اور مرزا پر مقدمہ قائم ہو گیا۔

آخر کار مرزا کو چھ ماہ قید اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ یہ واقعہ مرزا پر بہت شاق گزرا وہ اس بات کو اپنے نیز اپنے خاندان کے لئے بڑی بے عزتی کی بات سمجھتے تھے قید خانہ میں وہ بڑے آرام سے رہتے ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

نصف میعاد گزرنے پر مجسٹریٹ کو خیال آیا کہ مرزا بے گناہ ہیں اس لئے ان کو رہا کر دیا گیا۔ مرزا نے اس کو فارسی کے ایک خط میں اس طرح سے ظاہر کیا ہے۔

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سیشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا۔ اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا۔ اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اس نے اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا۔ مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا۔ کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی آ گیا۔ حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی تعریف کی سنا ہے کہ رحمدل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفریں کی اور میری خاکساری اور آزردہ حالی سے اس کو مطلع کیا"

اس زمانے میں جبکہ رشتہ داروں۔ عزیزوں اور دوستوں

سب نے مرزا ساتھ چھوڑ دیا تھا صرف نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہی ایسے شخص تھے جو آخر وقت تک مرزا کے مقدمہ کی پیروی کرتے رہے ان سے ملنے کے لئے قید خانہ جایا کئے اور ان کی مالی مدد کرتے رہے۔

شاہی ملازمت

رہائی کے کچھ عرصے بعد مرزا صاحب نے کالے خاں مرشد بہادر شاہ ظفر کی سفارش سے شاہی دربار میں باریابی حاصل کرلی مرزا صاحب نے بادشاہ کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے تھے اور انہیں انعام واکرام مل جاتا تھا۔

اسی اثناء میں بہادر شاہ کو تیموری خاندان کی تاریخ لکھوانے کا خیال پیدا ہوا مرزا کی فارسی مستند سمجھی جاتی تھی یہ کام ان کے سپرد ہوا۔ مرزا نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب سے سرفراز فرما کر حسب دستور چھ پارچے کا خلعت اور تین جواہر عطا فرمائے گئے اور مرزا کو ۱۸۵۰ء میں درباری مورخ مقرر کیا۔

مرزا صاحب نے اس تاریخ کا نام "پرتوستان" رکھا پہلے حصّہ کا نام جس میں شاہ تیمور سے لیکر ہمایوں تک حالات درج ہیں "مہر نیم روز" ہے۔

شاہان تیموری کی تاریخ کا پہلا حصّہ مہر نیم روز ۱۸۵۵ء میں چھپ کر شائع ہوا اور دوسرا حصّہ "ماہ نیم ماہ" ابھی چھپنے بھی نہ پایا تھا کہ غدر کا واقعہ رونما ہوگیا اور اس طرح یہ تاریخ نامکمل رہ گئی۔

مرزا کی مالی حالت اب قدرے اچھی ہوگئی تھی دربار کے تعلق کی وجہ سے شہر میں ہر جگہ ان کی عزت ہوتی تھی۔ ادھر ان کی شاعری کی دھوم تھی

بڑے بڑے مشاعروں میں بلائے جاتے تھے اور لوگ ان کے کلام کو آنکھوں میں جگہ دیتے تھے۔ اس زمانے میں ذوق اور مومن بھی شاہی دربار میں جاتے تھے ذوق بادشاہ کے استاد تھے لیکن پھر بھی ان تینوں باکمال شاعروں میں چشمک رہتی تھی۔

۱۸۵۲ء میں مومن کا انتقال ہوگیا اور اس کے دو سال بعد ۱۸۵۴ء میں ذوق راہی ملک بقا ہو گئے ان شاعروں کی وفات کے بعد بادشاہ کے اشعار کی اصلاح ان کے سپرد ہو گئی

غدر ۱۸۵۷ء

اپریل ۱۸۵۷ء تک تمام ملک انگریزوں کے قبضہ میں آگیا تھا صرف دلی کا قلعہ باقی تھا جہاں خاندانِ مغلیہ کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت تھی لیکن قلعہ سے باہر تمام دلی میں انگریزی سرکار کا حکم چلتا تھا لیکن ہندوستان کے تمام لوگ انگریزوں کی چیرہ دستیوں اور برتاؤ سے خوش نہ تھے بعض تو ان سے مصافحہ کرنے کے بعد اپنے ہاتھ دھوتے تھے۔

انگریزوں نے سکولوں میں بائبل کی تعلیم لازمی کر دی تھی اور مشنریاں قائم کردی تھیں جو لوگوں کو عیسائی بناتی تھیں ان حالات کے ماتحت ان کے خلاف لوگوں کی نفرت بڑھتی جاتی تھی۔

سب سے پہلے دیسی سپاہیوں نے میرٹھ میں اپنے افسروں کے حکم ماننے سے انکار کردیا۔ جب ان پر زیادہ سختی کی گئی تو انھوں نے بغاوت کردی اور اپنے افسروں کو قتل کردیا۔ اور راستہ میں قتل و غارت کرتے ہوئے دلی پہنچے۔ بخت خاں ایک مشہور فوجی افسر ان کی رہنمائی کررہا تھا۔

بہادر شاہ اس واقعہ سے بہت متأثر ہوئے ایک دن انھوں نے اپنے بعض مصاحبوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"تم جانتے ہو کہ آج کل جو سامان ہو رہا ہے اس کا انجام کیا ہونے والا ہے حمید خاں جمعدار نے عرض کی حضور ڈیڑھ سو سال کے بعد حضور کا اقبال یاور ہوا ہے گئی ہوئی سلطنت پھر واپس آتی ہے۔

بادشاہ سلامت نے فرمایا:۔

"تم لوگ نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں مجھ سے سُن لو کہ میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا یعنی بنا رفساد، مال و دولت، خزانہ، ملک و سلطنت وغیرہ ہوا کرتے ہیں میرے پاس ان میں سے کوئی چیز موجود نہ تھی میں تو پہلے ہی فقیر بیٹھا ہوا تھا مجھ کو کسی سے کیا خصومت میں تو ایک گوشۂ ایزدی میں فقیر کا تکیہ بنائے ہوئے چار صد توں کو ہمراہ لئے بیٹھا روٹی کھاتا ہوں میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا اب جو منجانب اللہ میرٹھ سے آگ لگی اور دلی آکر بھڑکی فتنہ برپا ہوا فلک غدار اور زمانہ ناہنجار کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے آج تک سلاطین چغتائیہ کا نام چلا آتا تھا اور اب آیندہ کو نام و نشان بیک قلم نابود ہو جائے گا اس کے بعد انگریز

لوگ میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعہ کے کنگرے پر چڑھا دیں گے۔ اللہ
تم لوگوں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑیں گے اگر کوئی باقی رہ جائے گا تو میرا
قول یاد رکھئے گا۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا باغیوں کے سردار
بخت خاں نے بہادر شاہ سے درخواست کی کہ وہ شاہ ہند ہونے کا اعلان
کر دیں ہم انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیں گے اور مغلیہ خاندان
کی حکومت قائم کر دیں گے۔ لیکن بہادر شاہ کو اپنا انجام معلوم تھا اس
لئے انھوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا آخر کار باغی شہر میں پھیل گئے اور
قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا جو انگریز جہاں نظر آیا مار دیا گیا۔

آخر کار انگریزوں نے پنجاب سے دیسی سپاہیوں کی تازہ دم فوج منگائی
اور راجپوت گڑھ کو مورچہ بنا کر شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ باغیوں کی فوج
منظم نہ تھی نہ ان کے پاس کافی اسلحہ تھے لہٰذا ان کو شکست ہو گئی۔ ان کا سردار
کسی نامعلوم جگہ فرار ہو گیا اور ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر پھر انگریزوں کے قبضے میں
آ گیا۔

مرزا غالب نے لکھا ہے کہ فتح مند فوج جب شہر میں داخل ہوئی تو لوگ
بلا امتیاز قتل ہونے لگے معزز اصحاب نے گھر کے دروازے بند کر لئے۔
انگریزوں نے غضب کی حالت میں قصور و بے قصور سب کو مارنا شروع کر دیا۔
اکثر گھروں میں آگ لگا دی گئی ہزاروں آدمی دلی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ شہر کی
تمام دکانیں بند تھیں گندم فروش۔ دھوبی۔ حجام خاکروب سب غائب

ہو گئے۔ اکثر لوگ فاقہ سے زندگی بسر کر رہے تھے میٹھا پانی دور دور تک نہیں ملتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے بارش ہو گئی تو لوگوں نے گھروں کے اندر کچھ پانی پینے کے لئے جمع کر لیا۔

جیسے ہی بغاوت رونما ہوئی۔ مرزا نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور جب تک امن نہ ہو گیا اپنے گھر سے باہر نہ نکلے۔ جو دیکھتے تھے یا سنتے تھے لکھ لیتے تھے چنانچہ غدر سے متعلق تمام مضامین ان کی کتاب دستنبو میں درج ہیں یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور چھپ چکی ہے۔

ان دنوں مرزا کو اپنے چھوٹے بھائی مرزا یوسف بیگ کا ہر وقت خیال رہتا تھا اس لئے کہ وہ بیس سال سے دیوانے تھے۔ ان کی بیگم مرزا یوسف کو ایک عمر رسیدہ شخص اور خادمہ کے سپرد کر کے بچوں کو لیکر جے پور کو چلی گئیں مرزا یوسف بیگ مرزا غالب کے مکان سے کافی فاصلہ پر رہتے تھے اسی اثناء میں اس سن رسیدہ شخص نے مرزا غالب کو اطلاع دی کہ تین دن شدتِ بخار میں مبتلا ہو کر مرزا یوسف کا انتقال ہو گیا ہے اس خبر کو سن کر مرزا کو انتہائی رنج ہوا۔ اس وقت کفن کے لئے کپڑا ملنا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ میت کو قبرستان لے جانا تو بہت ہی مشکل تھا۔ کیونکہ چاروں طرف پہرہ لگا ہوا تھا۔ مرزا کے ہمسایوں نے پٹیالہ کی فوج کے ایک سپاہی کے ہمراہ مرزا غالب کے گھر سے دو چادریں لیں اور مرزا یوسف کے مکان پر جا کر پہلے انہیں غسل دیا۔ پھر انہیں دونوں چادروں میں کفنا کر گھر کے نزدیک مسجد تہوّر خاں کے صحن میں دفن کیا۔

چند دن کے بعد کچھ گورے مرزا غالب کے مکان میں بھی گھس گئے اُنھوں نے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مرزا غالب اور اُن کے نوکروں اور چند ہمسایوں کو پکڑ کر کرنل براؤن کے پاس لے گئے۔ جو مرزا کے مکان کے قریب حاجی قطب الدین کے مکان میں موجود تھے۔

کرنل نے مرزا کی عجیب وغریب ہیئت دیکھ کر پوچھا "ول تم مسلمان ہو" مرزا نے جواب دیا "آدھا" کرنل نے پھر پوچھا۔ یہ آدھا مسلمان کیا ہوتا ہے؟" مرزا نے جواب دیا کہ ...... شراب پیتا ہوں، سُور نہیں کھاتا" مرزا کا یہ جواب سُن کر کرنل صاحب بہت ہنسے گئے اور باتیں دریافت کیں۔ اور نہایت عزت اور مہربانی کے ساتھ مرزا اور اُن کے ساتھیوں کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

مرزا کے دوستوں پر مصیبت

شہر کے تمام معزز لوگوں سے مرزا کے تعلقات تھے ان میں سے کچھ تو مرزا کے گہرے دوستوں میں تھے جو تکلیف کے وقت مرزا کی مدد کرتے تھے کچھ ایسے شاعر اور اہلِ قلم تھے جو مرزا کی دوستی پر فخر کرتے تھے غدر کے زمانے میں انگریزی حکومت نے ان کے اکثر دوستوں پر بغاوت کا الزام لگایا۔ اور ان پر مقدمہ چلا کر ان کو کسی نہ کسی مصیبت میں پھنسا دیا ان میں سے بعض خاص دوست یہ تھے۔

(۱) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ جو فارسی اور اُردو کے نہایت اچھے شاعر تھے اور مرزا کی بڑی مدد کرتے تھے۔ جب قمار بازی کے الزام

بس مرزا پر مقدمہ چلا اور ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تو بھی نواب شیفتہ تھے جنھوں نے آخر دم تک مرزا کا ساتھ دیا۔ دلی کے بڑے بڑے حکام سے ملے اور مرزا کے الزام کو جھوٹا کر کے رہائی کی کوشش کی اور مقدمہ میں جتنے مصارف ہوئے سب اپنے پاس سے ادا کئے۔ سزا یابی کے بعد وہ قید خانہ میں برابر ملتے رہے۔ اور خود ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مجھے مرزا کے زہد و اتقا کی وجہ سے ان سے عقیدت نہ تھی جس کا الزام آج عائد ہوا۔ مگر شراب پینا تو مجھے ہمیشہ سے معلوم ہے پھر اس الزام میں گرفتاری کی وجہ سے میری عقیدت کیوں متزلزل ہو۔"

نواب شیفتہ کو بغاوت کے جرم میں سات سال کی سزا ہوئی ان کی گرفتاری کے بعد مرزا صاحب نے بھی ان کی رہائی کے لئے بہت کوشش کی۔ جب اپیل کے بعد وہ رہا ہوئے تو مرزا صاحب سب سے پہلے ان سے ملاقات کرنے میرٹھ پہونچے۔

(۲) مولوی فضل حق خیرآبادی۔ مرزا کے بڑے گہرے دوست تھے انھیں کے مشورہ سے مرزا نے اپنے دیوان میں سے مشکل اور پیچیدہ اشعار نکال کر موجودہ دیوان مرتب کیا تھا۔ ان ہی کی وساطت سے نواب یوسف علی خاں والی رام پور سے تعلقات ہو گئے بغاوت کے جرم میں وہ جلا وطن کر دیئے۔ اور ہندوستان سے باہر ہی وفات پائی۔

(۲) مفتی صدر الدین آزردہ فارسی کے اعلیٰ شاعر تھے مرزا کے بڑے دوست تھے اور صدر الصدور کے عہدے پر فائض تھے۔ گرفتار کر لئے گئے ایک عرصہ تک جیل میں رہے بڑی مشکل سے جان بچی پھر بھی بہت سی جائیداد ضبط ہو گئی۔ اتنی رہی کہ مشکل سے گزر ہو سکے۔

شہر کے بڑے بڑے رئیس جن پر ذرا سا بھی شبہ ہوا، کہ اُنھوں نے باغیوں کی مدد کی ہے یا انگریزی فوج سے مقابلہ کیا ہے پکڑ لئے گئے جیسے عبدالرحمٰن والی جھجر احمد علی خاں والی فرخ نگر بہادر جنگ خاں والی بہادر گڑھ۔ ناہر سنگھ والی بلبھ گڑھ وغیرہ ایک ایک کر کے ان کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ۱۸ ستمبر کو قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ شہزادوں کو گرفتار کر کے گولی سے مار دیا گیا اور بادشاہ پر بغاوت کا الزام لگا کر مقدمہ قائم کر دیا گیا اور کچھ عرصہ بعد مجرم قرار دے کر رنگون بھیج دیا گیا۔

مسلمانوں پر خاص طور پر سختی کی جا رہی تھی۔ کسی نے یہ اطلاع دی کہ شریف خانی حکیموں کا مکان پٹیالہ کے سپاہیوں کی حفاظت کی وجہ سے مسلمانوں کی پناہ گاہ بن گیا ہے تو حکیم محمود خاں صاحب کو معہ ساٹھ آدمیوں کے گرفتار کر لیا گیا۔

مرزا شہر کی ویرانی کا حال ان الفاظ میں لکھتے ہیں:۔

اپنے مکان میں بیٹھا ہوا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آئے شہر میں ہے کون جو میرے پاس آئے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے

ہیں مجرم سیاست پائے جاتے ہیں جرنیلی بندوبست (مارشل لا)
یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے
کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے اُمور کی طرف
حکام کی توجہ ہی نہیں دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے۔

دستنبو میں لکھتے ہیں :۔

واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا
غریب کیا اہل حرفہ کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔

میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

روز اس شہر میں ایک نیا حکم ہوتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوتا ہے
میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور حالت یہ ہے
کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں لاہوری دروازہ کا تھانہ
دار مونڈھے بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر
آجاتا ہے اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے حاکم کے ہاں
سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے آٹھ
دن قید رہتا ہے اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت
کرو کہ کون بے ٹکٹ مقیم ہے تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے
ہیں۔

یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا میں نے کہا بھائی تو مجھے ان نقشے
میں نہ رکھ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ عبارت یہ ہے کہ

اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کی حویلی میں رہتا ہے نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے زمانے میں نکلا۔ اور نہ نکالا گیا۔ کرنل براؤن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا دارومدار ہے اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا اب حاکم وقت کو اختیار ہے پرسوں یہ عبارت جامع دار نے محکمہ کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیجدی ہے کل سے یہ حکم نکلا ہے کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دروکان کیوں بناتے ہیں انھیں ڈھادو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنادو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر مقدور نذرانہ دے اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ آپ شہر میں آباد ہو جائے آج تک یہ صورت ہے دیکھئے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے جو رہتے ہیں اخراج کئے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔

غدر کے بعد دہلی کا نقشہ

ایک اور خط میں میر مہدی کو لکھتے ہیں۔

پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا مسجد جامع سے راج گھاٹ تک بلا مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا

عالم ہو جائے یاد کرو کہ مرزا گوہر کے باغیچے کے اُس جانب کئی بانس نشیب تھا اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا فصیل کے کنگورے کھلے رہتے ہیں باقی سب اٹ گیا ہے کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو اب آہنی سڑک (ریل کی پٹری) کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا پنجاب کٹرہ۔ دھوبی واڑہ۔ رامجی گنج۔ سعادت خاں کا کٹرہ۔ جرنیل بی بی کی حویلی رامجی داس گودام والے کے مکانات صاحب رام کا باغ وحویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں ملتا قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا ہے۔ اور اب جو کوئیں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا۔ تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائیگا اللہ دلی والے آج تک یہاں کی زبان کو اچھا سمجھتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد بندۂ خدا اُردو بازار نہ رہا اُردو کہاں دلی کہاں واللہ اب شہر نہیں کیمپ ہے چھاؤنی ہے نہ قلعہ ہے۔ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔

فتح دہلی کے کوئی پانچ سال بعد ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

جو یائے حال دہلی والو سلام لو۔ مسجد جامع واگزاشت ہو گئی چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دوکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی۔ کبوتر بکنے لگے دس آدمی منتظم ٹھہرے۔ مرزا الٰہی بخش۔

مولوی صدر الدین۔ تفضل حسین خاں یہ تین۔ سات اور ۸ نومبر۔
۱۴ جمادی الثانی۔ سال حال جمعہ کے دن ابوالمظفر سراج الدین
بہادر شاہ قید فرنگ و جسم سے رہا ہوئے۔

مرزا کی آمدنی کے دو ہی ذریعہ تھے۔ قلعہ معلیٰ سے تنخواہ اور سرکاری پنشن غدر کی وجہ سے دونوں جگہ کی آمدنی بند ہو گئی۔ شہر کے معزز اور عمائد گرفتار ہو گئے تھے مرزا کی گزران ان دنوں اس زمانے میں بڑی مشکل سے ہوتی تھی لوٹ کے خوف سے بیگم مرزا نے تمام زیور اور لوگوں کی طرح نصیر الدین عرف کالے صاحب کے یہاں ان کے مکان کے صحن میں دبا دیا لیکن فوجی سپاہی کھود کر نکال کر لے گئے۔

اس مفلسی اور تنگدستی کے زمانے میں بھی برابر غریبوں کی مدد کرتے رہے اور اپنے کسی ملازم کو علیحدہ نہیں کیا۔

غدر کے بعد دس سال کا زمانہ

۱۸۵۷ء میں جب نواب یوسف علی خاں رام پور میں تخت نشین ہوئے۔ تو مرزا نے قطعہ تاریخ جلوس لکھ کر بھیجا۔ دربار رام پور سے اس کا کوئی جواب نہ آیا۔

مولانا فضل حق خیرآبادی رام پور میں فروکش تھے۔ جب نواب صاحب سے ملے تو مرزا نے تبحر علمی اور شعر و شاعری کا ذکر ضرور کرتے اور نواب صاحب کو ان کے چیدہ اشعار بھی سناتے نواب صاحب خود بھی بڑے علم دوست

تھے۔ آخر کار وہ بھی آہستہ آہستہ مرزا کے معتقد ہو گئے۔ چنانچہ مرزا نے ایک خط میں بے خبر کو لکھا :-

"نواب یوسف علی خاں والی رام پور میرے آشنائے قدیم ہیں اس سال ۱۸۵۷ء میں میرے شاگرد ہوئے اور ناظم تخلص ان کو دیدیا گیا ہیں پچیس غزلیں اردو کی بھیج دی ہیں۔ اور میں نے انھیں اصلاح کر کے بھیج دیا ہے گاہ گاہ ادھر سے کچھ روپیہ آجاتا ہے۔"

۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۹ء تک غدر کی پریشانی کے باعث دربار رام پور سے کوئی خط و کتابت نہ ہو سکی لیکن نواب صاحب کو اپنے استاد مرزا غالب کی پریشانی اور تنگدستی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے سو روپیہ ماہوار تاحیات ان کی تنخواہ مقرر کر دی اور مرزا صاحب کو نواب صاحب کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ :-

"بنظر آپ کی زیر باری کے اس مہینہ سے سو روپیہ ماہوار مقرر کیا گیا اور دفتر میں آپ کا نام مندرج کیا گیا ہر مہینہ تنخواہ مقررہ پہنچے گی۔"

غدر کے بعد جب ہر طرف امن و امان ہو گیا تو نواب رام پور نے مرزا کو رامپور آنے کی دعوت دی اور متواتر کئی محبت آمیز خطوط لکھے چونکہ مرزا کی پنشن اور دربار وغیرہ بند ہو گئے تھے اور وہ پنشن کی اجراء کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے اس لئے کوئی نہ کوئی عذر لکھ کر بھیج دیتے تھے۔

آخر کار چھٹی دعوت کے جواب میں نواب صاحب کے اخلاق اور محبت سے متاثر ہو کر مرزا نے رام پور جانے کا قصد کیا ادھر مرزا بھی پنشن کے متعلق مایوس ہو چکے تھے اس زمانے میں نواب رام پور انگریزوں کے بڑے دوست سمجھے جاتے تھے مرزا نے سوچا کہ نواب صاحب کی وساطت سے انگریزی حکومت سے صلح صفائی ہو جائے تو بہتر ہے چنانچہ جنوری ۱۸۶۰ء میں مرزا رام پور تشریف لے گئے۔

نواب صاحب نے ان کی تعظیم اور خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور بہت دوستانہ طور پر ملاقات ہوئی۔ نواب صاحب نے مرزا کے متعلق یہ فیصلہ کیا کہ اگر وہ رام پور میں رہیں تو انھیں دو سو روپیہ ماہوار ملیں گے، سو روپے بطور مہمانی کے اور سو روپیہ تنخواہ کے۔ اور دہلی ہی میں رہیں گے تو صرف سو روپیہ ماہوار ملیں گے پھر بھی مرزا صاحب تقریباً دو ماہ رام پور میں رہ کر دہلی چلے آئے۔

سرسید احمد خاں صاحب سے صلح

سرسید احمد خاں نے آئین اکبری مصنفہ ابوالفضل کی تصحیح کر کے اسے دوبارہ چھپوانا چاہا اور مرزا کے پاس اس کی ایک جلد بھیجی کہ وہ اس پر تقریظ لکھ دیں مرزا کو ابوالفضل کا طرز تحریر پسند نہ تھا اس کے علاوہ وہ اکبر کے آئین کو اس زمانے کے موجودہ آئین سے بہتر نہیں سمجھتے تھے اس لئے ان کو اس کتاب سے کوئی دلچسپی نہ تھی انھوں نے اس کتاب کے متعلق ایک مثنوی لکھ کر سرسید احمد خاں کے پاس بھیج دی جس میں اکبر کے آئین و قوانین

کوئی ہیچ دپوچ ثابت کیا گیا تھا سر سید مرزا کی تقریظ سے خوش نہ ہوئے کتاب کو چھپوا دیا لیکن اس میں مرزا کی تقریظ کو شامل نہ کیا اس وجہ سے دونوں میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔

مرزا صاحب جب نواب رامپور سے ملاقات کر کے واپس ہوئے۔ تو مراد آباد کی سرائے میں قیام پذیر ہوئے سرسید احمد خاں اس وقت مراد آباد میں صدر الصدور تھے ان کو جب مرزا کی آمد کا حال معلوم ہوا۔ تو بذاتِ خود مرزا کو لینے کے لئے سرائے میں پہنچے ان کا سامان اٹھوا کر مع ان کے ہمراہیوں کے اپنے گھر لے گئے۔ جب مرزا پالکی سے نیچے اترے تو شراب کی بوتل مرزا کے ہاتھ میں تھی مرزا نے اسے ایک جگہ رکھ دیا لیکن سرسید نے بوتل کو اٹھوا کر سامان کی کوٹھری میں رکھ دیا تاکہ ہر شخص کی نظر نہ پڑے مرزا نے جب بوتل کو اپنی جگہ پر نہ دیکھا تو بہت گھبرائے سرسید احمد خاں سے دریافت کیا اُنھوں نے کہا گھبرایئے نہیں آپ کی بوتل بڑی احتیاط سے رکھی ہے مرزا نے کہا بھئی مجھے دکھا دو تاکہ اطمینان ہو جائے سرسید نے کوٹھری میں جا کر بوتل کو دکھا دیا مرزا نے بوتل کو ہاتھ میں اُٹھایا اور اسے دیکھ کر کہا اس میں سے کچھ کم ہو گئی غالباً کسی نے امانت میں خیانت کی ہے سچ بتایئے کہ کس نے پی ہے سرسید احمد خاں اس بات کو سُن کر ہنس پڑے اور ایک عرصہ سے جو مابین کشیدگی پیدا ہو گئی تھی وہ دُور ہو گئی۔

قاطع برہان

غدر کے بعد جب ہر طرف امن و امان ہو گیا اور مرزا دستنبو کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو اُنھوں نے

فارسی کی ایک مشہور لغت بُرہانِ قاطع کو دیکھنا شروع کیا۔ اس وقت یہی کتاب ان کے پاس موجود تھی اس لغت کے مصنف محمد حسین تبریزی تھے جو دکن میں رہتے تھے مرزا نے اس کتاب کے بارہ میں صاحب عالم مارہروی کو ایک خط میں لکھا۔

"اس درماندگی کے دنوں میں برہان قاطع میرے پاس تھی اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط ہزارہا بیان لغو عبارت پوچ اشارات بادر ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنا دیا ہے اور "قاطع برہان" اس کا نام رکھ دیا ہے۔"

یہ کتاب ۱۲۷۶ھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اسی کتاب کو مرزا نے اضافہ اور ترمیم کے ساتھ دوبارہ چھپوایا تو اس کا نام "درفش کاویانی" رکھا قاطع برہان کی اشاعت کے بعد مرزا کی بڑی مخالفت ہوئی اور مرزا پر اعتراضات کی بھرمار ہوگئی۔ برہان کے جواب میں کئی رسالے محرق قاطع۔ ساطع برہان قاطع قاطع اور موئد برہان کے نام سے شائع ہوئے جن میں برہان قاطع کی حمایت کی گئی اور مرزا کی تحقیق کو غلط ثابت کیا گیا۔ "تیغ تیز" میں مرزا پر ذاتی حملے بھی کئے گئے اس کتاب کے مصنف مولوی امین الدین تھے مرزا نے ان پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ لیکن آخر میں دوستوں کے کہنے سے راضی نامہ داخل کر دیا۔

مرزا کی وفات کے دس بارہ سال بعد ایران کے ایک مشہور مصنف رضا قلی خاں کی ایک لغت فرہنگ ناصری ہندوستان میں آئی یہ کتاب

مرزا کی وفات کے چار برس بعد ۱۲۸۸ھ میں چھپی اس کتاب میں فرہنگ جہانگیری فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع کی غلطیوں اور لغزشوں کو بیان کیا گیا تھا۔ اور ایک باب میں تو صرف برہان قاطع کی غلطیاں ظاہر کی گئیں تھیں اور مرزا غالب نے جو اعتراضات برہان قاطع پر کئے تھے وہ سب فرہنگ ناصری میں موجود تھے اس فرہنگ کی اشاعت سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ مرزا کے مخالفین غلطی پر تھے اور مرزا حق پر تھے۔

ازالہ حیثیت عرفی کے مقدمہ کے ختم ہونے کے بعد حاسدوں اور مخالفوں نے مرزا کے نام گمنام خط بھیجنے شروع کئے کسی خط میں ان کی مے خواری کا مذاق اُڑایا جاتا اور کسی میں ان کی مذہب سے بیگانگی اور آزاد روی پر لعن طعن ہوتی اس زمانہ میں مرزا نہایت کبیدہ خاطر اور رنجیدہ رہا کرتے تھے۔

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ اتفاق سے انھیں دنوں میں نواب مصطفیٰ خاں کے ساتھ مجھے دہلی آنے کا اتفاق ہوا چونکہ مجھ کو ان نالائق گمنام خطوط کے آنے کا حال معلوم نہ تھا ایک روز مجھ سے ایسی غلطی ہوئی جس کے تصور سے مجھے ہمیشہ شرمندگی ہوتی تھی۔

ایک روز مرزا کی کبرسنی اور بزرگی کو بالائے طاق رکھ کر ان کو نصیحت کرنی شروع کی چونکہ ان کا ثقل سماعت انتہا درجہ کو پہنچ گیا تھا اور ان سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعہ کی جاتی تھی نماز کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لیکچر لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا۔

مرزا کو یہ تحریک سخت ناگوار گزری اور ناگوار گزرنے کی بات ہی تھی
صوصاً اس وجہ سے کہ انہیں دنوں بعض لوگ گمنام خطوط میں ان کے
عمال اور افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کر رہے تھے
رزا صاحب نے میری لغو تحریر دیکھ کر فرمایا جو کچھ فرمایا وہ سننے کے لائق ہے
نھوں نے کہا یہ ساری عمر فسق و فجور میں گزری نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ
کھا نہ کوئی نیک کام کیا زندگی کے چند سانس باقی رہ گئے ہیں اب اگر چند
وز بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے سارے گناہوں کی تلافی کیونکر
و سکے گی۔

بڑھاپے کے زمانے میں مرزا کئی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے تھے ہاتھوں
اور ران میں پھوڑے نکل آئے تھے جس سے اُٹھنے اور بیٹھنے میں بھی
ڑی تکلیف ہوتی تھی شراب نوشی نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا جوانی
یں تو اس کا نقصان ظاہر نہ ہوا بڑھاپے میں جب قویٰ کمزور ہو گئے تو
س کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔

غالب کو مدت سے سلسل بول کا عارضہ تھا ذیابیطس بھی ہو گئی تھی
ہ پاؤں میں ورم آ گیا تھا اُٹھنے بیٹھنے سے معذور ہو گئے تھے خون فساد
بیماری بھی تھی ثقل سماعت کی شکایت تو بہت پہلے سے تھی اب آنکھوں
سے بھی کم نظر آنے لگا تھا وفات سے ایک روز پیشتر جب خواجہ حالی
عیادت کیلئے گئے تو مرزا بے ہوش تھے جب افاقہ ہوا تو نواب علاء الدین
خط میں لکھوایا۔

میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ایک آدھ روز میں میرے ہمسایوں
سے پوچھنا۔
یہ شعر اکثر پڑھتے رہتے تھے۔

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

وفات آخرکار ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو شاعری کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ شہر کے تمام اکابر اور عمائدان کے جنازے میں شریک ہوئے شیعہ حضرات چاہتے تھے کہ ان کے جنازے کی نماز اپنے رسم و رواج کے مطابق پڑھیں لیکن ضیاء الدین احمد خاں نے تمام رسمیں اہل سنت کے مطابق ادا کیں اس لئے کہ وہ غالب سے بہت قریب تھے اور ان کے مذہب کے متعلق بہت زیادہ واقف تھے دہلی دروازہ کے باہر ان کے جنازے کی نماز پڑھی گئی شہر کے ہزاروں آدمی ان کی میت کے ساتھ تھے وہ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے قریب نواب الٰہی بخش معروف اپنے خسر کے پہلو میں دفن ہوئے مرزا کا مزار پہلے شکستہ حالت میں تھا لیکن اب ان کا مزار سنگِ مرمر کا بنوا دیا گیا ہے۔ اور مزار کا بڑا دالان سنگ سرخ سے مزین کیا گیا ہے۔ جو لوگ ہندوستان یا بیرون ہندوستان سے دہلی دیکھنے کو آتے ہیں وہ مرزا کے مزار کو بھی ضرور دیکھتے ہیں ہر سال مرزا کے مزار پر ان کی برسی منائی جاتی ہے جس میں مرزا کا کلام پڑھا جاتا ہے اور مرزا کی تعریف میں شعرا اپنا کلام بھی سناتے ہیں۔

مزار مرزا غالب
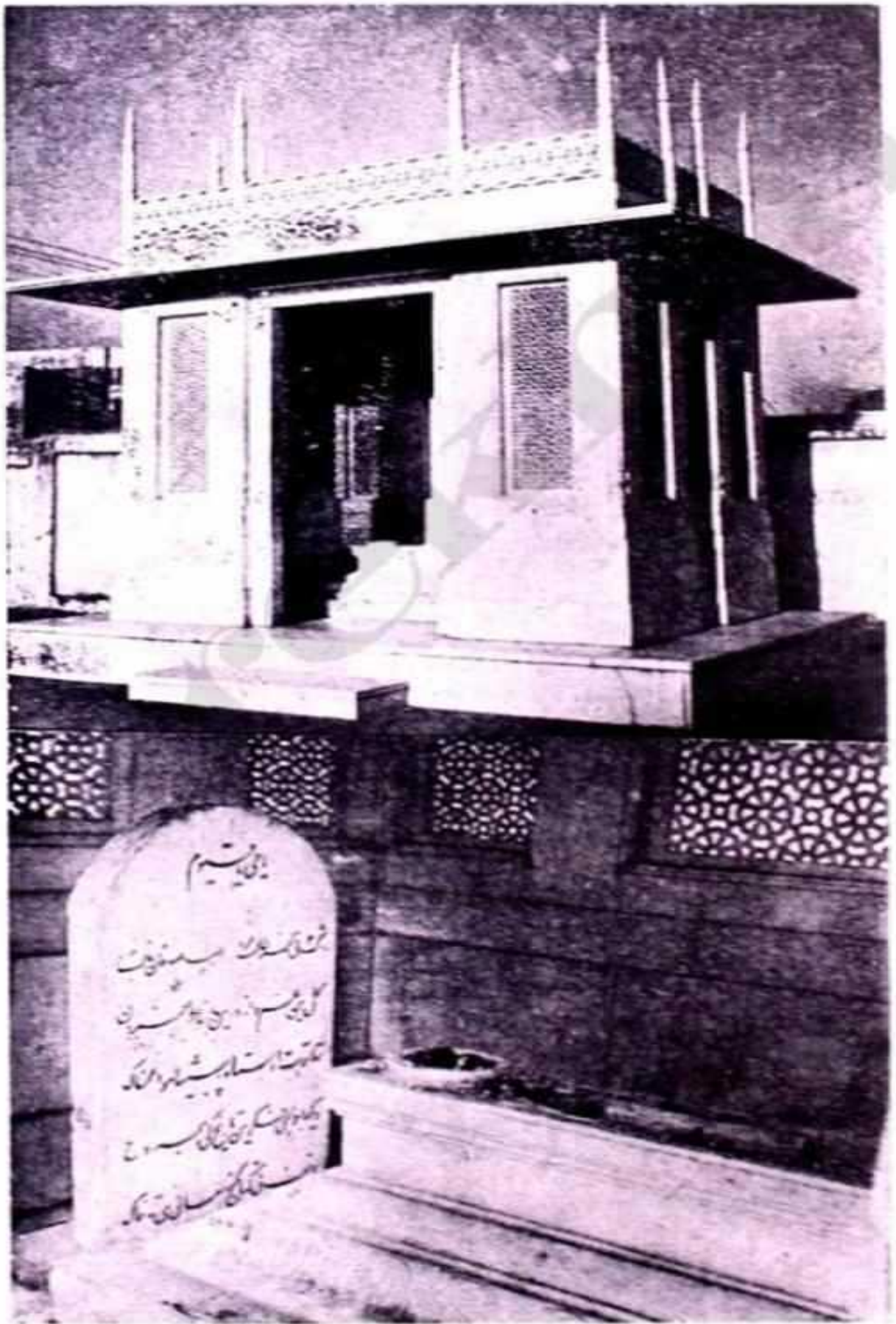
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مرزا کے اخلاق و عادات

مرزا کا مشرب صلح کل تھا

آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

مرزا اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ اُن سے کسی کی دل
زاری نہ ہو کسی سے مذہبی بحث نہ چھیڑتے کسی کے مذہب کو بُرا نہ
ہتے ہندو مسلمان انگریز سب ہی سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے ان
ے شاگردوں کا سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔

(۱)

بہار کے رہنے والے سید غوث علی شاہ قلندر سلسلہ قادریہ کے
شہور بزرگ تھے وہ بڑے سیاح تھے شاہ صاحب جب دہلی گئے تو مرزا
الب سے بھی ان کی ملاقات ہوئی وہ زینت المساجد میں مقیم تھے۔
ور تقریباً چھ ماہ تک دہلی میں فروکش رہے مرزا کی شہرت سُن کر پہلے
ہ وہ خود مرزا صاحب سے ملنے کے لئے ان کے مکان پر گئے اس کے

بعد مرزا صاحب ہر دو سرے تیسرے دن شاہ صاحب سے ملنے کے لئے آتے تھے اور بعض دفعہ کھانے کا ایک توخوان بھی اپنے ہمراہ لاتے تھے۔

شاہ صاحب کو مرزا سے بڑی محبت تھی وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے ان کی ملفوظات میں غالب کے مندرجۂ ذیل اشعار پائے گئے ہیں۔

اصل شہود شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

بے خودی بے سبب نہیں غالب — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

(۲)

مرزا رجب علی بیگ سرور سے ملاقات

ایک مرتبہ مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب لکھنؤ سے دہلی آئے اور مرزا غالب سے ملے مرزا نے مرزا رجب علی بیگ کا نام تو سنا تھا لیکن ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی دوران گفتگو میں رجب علی بیگ نے مرزا سے پوچھا آپ کے نزدیک کس کتاب کی زبان

اُردو عمدہ ہے مرزا نے جواب دیا قصہ چہار درویش کی۔ رجب علی بیگ نے پھر پوچھا اور فسانۂ عجائب کیسی ہے مرزا نے کہا لاحول ولا قوۃ۔ اس میں زبان کا لطف ہی کہاں ہے ایک تک بندی ہے۔

جب رجب علی بیگ سُرور چلے گئے تو انھیں بتایا گیا کہ جس سے آپ گفتگو کر رہے تھے یہ خود رجب علی بیگ سُرور تھے مرزا نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا دوسرے دن پھر سید غوث علی شاہ قلندر کے پاس زینت المساجد میں تشریف لے گئے ان سے سارا واقعہ بیان کیا اور کہا مجھ سے نادانستگی میں بڑی غلطی ہو گئی ہے ذرا میرے ہمراہ چلئے رجب علی بیگ سُرور کے پاس جا کر معذرت کر آئیں۔

مرزا صاحب شاہ صاحب کے ہمراہ رجب علی بیگ کی قیام گاہ پر پہونچے رجب علی بیگ بڑے تپاک سے ملے مرزا نے کہا جناب رات کو میں نے فسانۂ عجائب کو غور سے پڑھا اس کی خوبی اور رنگینیٔ عبارت کیا بیان کروں نہایت ہی فصیح و مرصع عبارت ہے میرے خیال میں تو ایسی نثر نہ پہلے ہوئی نہ آگے ہو گی۔

غرضیکہ مرزا نے ایسی باتیں کر کے رجب علی بیگ کے دل سے غبار کو دھو دیا دوسرے دن ان کی دعوت کی شاہ صاحب کو بھی بلایا اور اس دن بھی میاں سرور کی عبارت آرائی کی بہت تعریف کی۔

اس کے بعد جب زیادہ مراسم بڑھ گئے تو مرزا رجب علی بیگ سرور کی تصنیف "گلزار سرور" پر مرزا غالب نے ایک نہایت عمدہ تقریظ لکھی

فراخ حوصلگی

مرزا کی آمدنی اگرچہ بہت ہی قلیل تھی لیکن وہ غریبوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے کوئی سائل ان کے دروازہ سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا اکثر اپاہج اور بے کس لوگ مدد کے لئے اُن کے پاس آتے تھے۔ وہ اپنی حیثیت کے مطابق غریبوں اور بے کسوں کی مدد کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے ایک مرتبہ لفٹنٹ گورنر نے ان کو سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر دیا چپراسیوں نے حسب دستور انعام مانگا اُنھوں نے بازار میں خلعت کو فروخت کروا دیا۔ اور جو رقم حاصل ہوئی انعام دیکر اپنے گھر سے چپراسیوں کو رُخصت کیا۔

اُنھوں نے غدر کی تنگدستی کے زمانے میں بھی اپنے نوکروں کو علیحدہ نہیں کیا جو خود کھاتے تھے اُنہیں کھلایا اس زمانے میں بھی اپنے رشتہ داروں کی مدد کرتے رہے۔

مرزا اور آم

مرزا کو آم اور انگور بہت مرغوب تھے آموں کی فصل میں ان کے دوست دُور دُور سے بذریعہ پارسل ان کے لئے آم بھیجتے تھے کبھی کبھی مرزا صاحب بھی فرمائش کر کے اپنے دوستوں سے آم منگواتے تھے خود بھی شوق سے کھاتے تھے اپنے دوستوں کو بھی کھلاتے تھے۔

سیاح نے بمبئی سے جب آم بھیجنے کا ارادہ کیا اور مرزا صاحب سے دریافت کیا تو اُنھوں نے جواب میں لکھا۔

"آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں انگور سے کم عزیز نہیں لیکن بمبئی اور سورت سے یہاں پہنچنے کی کیا صورت مالدہ کا آم یہاں ولائتی اور پیوندی کرکے مشہور ہے اچھا ہوتا ہے کمال یہ ہے کہ وہاں بہت اچھا ہوگا سورت سے وگی آم بھیجنا محض تکلف ہے دو روپے کے آم اور چار روپے کا محصول ڈاک۔ پھر سو میں سے شاید دس پہنچیں۔ یہاں دیسی آم انواع واقسام کے بہت پاکیزہ اور لذیذ اور خوشبو دار افراط سے ہیں۔ سوسے آم بھی بہت ہیں۔ رام پور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر بہ سبیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں اے لو آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی دو ٹوکرے ہر ٹوکرے میں سو آم کلو داروغہ نے میرے دونوں ٹوکرے کھولے دو سو میں سے تراسی آم اچھے نکلے۔

صاحب عالم مارہروی کو ایک دعوت نامہ کے جواب میں خط لکھا۔

نہار منہ آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد بھی آم نہ کھاتا تھا رات کو کچھ کھاتا ہی نہ تھا جو کہوں (دو کھانوں کے درمیان) ہاں آخر روز بعد ہضم معدی آم کھانے بیٹھ جاتا تھا بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا کہ آم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔

ایک صحبت میں کسی نے مرزا سے دریافت کیا کہ آموں میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ مرزا نے کہا صرف دو باتیں "میٹھا ہو اور بہت ہو" مرزا کی یہ عجیب وغریب تعریف سُن کر سب لوگ ہنس پڑے۔

مرزا نے آموں کی تعریف میں ایک نظم بھی لکھی ہے جس کے چند شعر حسب ذیل ہیں۔

صفت انبہ

آم کا کون مرد میداں ہے — ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں — آئے یہ گوئے اور یہ میداں

نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے — آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار — جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار

لطیفہ

ایک مرتبہ بہادر شاہ ظفر کے ہمراہ مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے چاروں طرف رنگ برنگ کے آموں سے لدے ہوئے درخت عجیب بہار دکھا رہے تھے یہ شاہی باغ تھا جس کے آم سوائے شاہی خاندان کے کسی کو میسر نہ آتے تھے۔

مرزا بعض درختوں کے آموں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے کہ

بادشاہ نے پوچھا۔ مرزا اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو مرزا نے باادب عرض کیا حضور! کسی نے کہا ہے ہر دانہ پر اس کے کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کسی آم پر میرا نام بھی لکھا ہے یا نہیں؟

بادشاہ یہ جواب سُن کر بہت ہنسے اور دوسرے روز ایک بہنگی عمدہ آموں کی مرزا کے گھر پر بھجوا دی۔

لطیفہ

مرزا کے ایک دوست کو آم اچھے نہیں لگتے تھے ایک دن وہ مرزا کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک گدھے والا سامنے سے گزرا گدھے نے آموں کے پڑے ہوئے چھلکوں کو سونگھ کر چھوڑ دیا۔ دوست نے کہا مرزا صاحب دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا۔ مرزا نے جواب دیا بیشک گدھا آم کو نہیں کھاتا۔

خودداری ــــــ وضعداری

(۱) مرزا کی خودداری کا ایک واقعہ تو ہم ان کی سوانح حیات میں مفصل طور پر لکھ چکے ہیں کہ انھوں نے دِلّی کالج کی پروفیسری اس لئے قبول نہیں کی کہ پرنسپل صاحب جو انگریز تھے ان کے استقبال کے لئے باہر نہیں آئے۔ مرزا نے اس بات کو اپنی خودداری کے خلاف سمجھا۔ اور بلا ملازمت کے واپس چلے آئے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ کلکتہ کے سفر کے دوران میں کچھ دنوں انھوں نے لکھنؤ میں قیام کرنا مناسب سمجھا اس زمانہ میں نصیر الدین حیدر مسند نشین تھے اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے اہل لکھنؤ نے مرزا کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا اور ان کی بڑی خاطر و مدارات کی اور چاہا کہ نائب السلطنت کی وساطت سے مرزا شاہی دربار میں رسائی حاصل کریں مرزا نے نائب السلطنت کی ملاقات سے پہلے دو شرطیں پیش کیں۔

(۱) نائب السلطنت میری تعظیم دیں۔

(۲) اس کے علاوہ نذر دینے سے مجھے مستثنیٰ رکھا جائے۔

یہ دونوں شرطیں مانی نہ جاسکیں لہذا مرزا نائب السلطنت سے ملاقات کئے بغیر کلکتہ چلے گئے اور اپنی شان خودداری کو قائم رکھا۔

(۳)

شہر کے معززین و عمائد جب تک ایک مرتبہ مرزا کے مکان پر نہ آئیں وہ خود کبھی ان کے مکان پر نہیں جاتے تھے اور جو شخص ان کے پاس آتا تھا وہ اس سے ملنے کے لئے، اس کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔

ایک دن دیوان فضل اللہ خاں گاڑی پر سوار مرزا سے بغیر ملے نکلے ہوئے چلے گئے مرزا کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ لکھا۔

"آج مجھے جس قدر ندامت ہوئی ہے شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں

اس سے زیادہ نالائقی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی کبھی اس
طرف سے گزریں اور میں سلام کو حاضر نہ ہوں"
دیوان جی اس رقعہ کو پڑھ کر بہت شرمندہ ہوئے اور اُسی وقت
مرزا سے ملنے کے لئے آئے۔

مرزا کا حافظہ

مرزا کا حافظہ اور یادداشت کی قوت بہت زبردست تھی جو کتاب ایک مرتبہ پڑھ لیتے تھے وہ ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی ان کے پاس کوئی کتابوں کا ذخیرہ نہ تھا وہ کتابیں کرائے پر منگواتے تھے اور ان کو پڑھ کر واپس کر دیتے تھے ایک آدمی خاص اس کام پر مقرر تھا جو انھیں کتابیں لا کر دیتا تھا ان کتابوں میں جو ضروری اور اہم بات ہوتی وہ مرزا کے دماغ میں محفوظ ہو جاتی تھی برہان قاطع کے جواب میں جو کتاب قاطع برہان لکھی اسی حافظہ و یادداشت کی بدولت لکھی کوئی لغت یا کتاب ان کے پاس موجود نہ تھی کہ اس سے مدد لیتے۔

مرزا کو شعرائے متقدمین جیسے حافظ، سعدی، عرفی، بیدل وغیرہ کا کافی کلام یاد تھا جس کو وہ اکثر مضامین یا خطوط میں بے تکلف استعمال کر دیتے تھے۔

سخن فہموں کی قدر

مرزا کو جب کوئی سخن فہم اور ان کے کلام کو سمجھ کر ان کی قدر

والا مل جاتا تو اس کی بڑی عزت وخاطر و مدارات کرتے تھے۔

ایک مرتبہ منشی نبی بخش حقیر جو کسی زمانہ میں کول (علی گڑھ) میں سر رشتہ دار تھے اور جن کی سخن فہمی کی شہرت تھی دلی میں آئے اور مرزا کے مکان پر ٹھہرے مرزا کو ان کی تشریف آوری سے بڑی خوشی ہوئی چنانچہ منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں لکھا کہ :۔

"خدا نے میری بے کسی اور تنہائی پر رحم کیا اور ایک ایسے شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے زخموں کا مرہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا اور جس نے میری اندھیری رات کو روشن کر دیا اور اس نے اپنی باتوں سے ایک ایسی شمع روشن کر دی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی جو تیرہ بختی کے اندھیرے میں میری نگاہ سے مخفی تھی دیکھی۔ میں حیران ہوں کہ اس فرزانہ یگانہ یعنی منشی نبی بخش کو کس درجہ کی سخن فہمی اور سخن سنجی، عنایت ہوئی ہے حالانکہ میں شعر کہتا ہوں اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس کو نہ دیکھا تھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور فن فہم کس کو کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ خدا نے حسن کے دو حصے کئے آدھا یوسف کو دیا اور آدھا بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ سخن فہمی اور ذوق سخن کے بھی دو حصے کئے گئے ہوں آدھا منشی نبی بخش کو اور آدھا تمام دنیا کے حصے میں آیا ہو۔ گو زمانہ اور آسمان میرا کیسا ہی مخالف ہو میں اس شخص کی دوستی کی بدولت زمانے کی دشمنی سے بے فکر ہوں اور اس نعمت پر دنیا سے قانع۔

مرزا کی داد پسندی

مرزا بہت انصاف پسند طبیعت رکھتے تھے جب کسی شاعر کا اچھا شعر سنتے تو اس کی خوب داد دیتے تھے اور اپنے دوستوں میں اس کی بہت تعریف کرتے تھے اکثر اپنے شاگردوں کے اچھے اشعار سے متأثر ہوتے تھے۔

مومن۔ ذوق۔ اور سودا کے یہ تینوں اشعار مرزا کو بہت پسند تھے۔

(۱) تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(۲) اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(۳) دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن کوئی خواہاں نہیں واں جنس گراں کا

ظرافت

مرزا ہر جگہ اپنی شوخی اور ظرافت سے کام لے کر ایسی بات کہدیتے تھے جو سننے والوں کی دلچسپی کا سبب بن جاتی تھی اور لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱)

مرزا الٰہی بخش معروف مرزا کے خسر تھے وہ درویش تھے اور لوگوں کو مرید بھی کیا کرتے تھے اور بیعت کے بعد ایک شجرہ پیری مُریدی بھی ہر ایک کو دیا کرتے تھے ایک مرتبہ کسی مُرید کو دینے کے لئے انھوں نے مرزا غالب کو ایک شجرہ دیا کہ اس کی نقل کر دیں۔ مرزا نے شجرہ اس طرح نقل کیا کہ ایک نام لکھا اور دوسرا حذف کر دیا پھر تیسرا لکھ دیا اور چوتھا چھوڑ دیا اس طرح جان بوجھ کر شجرہ کو غلط اور نامکمل نقل کر کے دے دیا۔

مرزا الٰہی بخش نے جب یہ شجرہ دیکھا تو بہت ناراض ہوئے اور مرزا سے دریافت کیا کہ یہ شجرہ تم نے کیسا نقل کیا۔

مرزا نے جواب دیا قبلہ اس کا کچھ خیال نہ فرمائیے شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے سو زینے کی ایک سیڑھی اگر بیچ سے نکال دی جائے تو چنداں ہرج واقع نہیں ہوتا آدمی اُچک اُچک کر اوپر پہنچ سکتا ہے۔

یہ سُن کر مرزا الٰہی بخش بہت خفا ہوئے۔ اور مرزا سے پھر کبھی شجرہ نقل نہ کرایا اور مرزا کو غیر پسندیدہ کام سے ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی۔

(۲)

ایک رات مرزا کے ایک دوست سید سردار مرزا۔ مرزا سے ملنے کے لئے ان کے مکان پر آئے جب وہ جانے لگے تو مرزا خود شمع لے کر ان کے ساتھ آئے تاکہ وہ روشنی میں اپنا جوتا دیکھ کر پہن لیں سردار مرزا نے کہا

قبلہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی ۔ میں خود ہی جوتا پہن لیتا مرزا نے کہا میں
شمع آپ کو جوتا دکھانے نہیں لایا بلکہ اس لئے کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن
جائیں ۔

ایک صحبت میں ذوق اور دوسرے شعرا موجود تھے مرزا نے میر تقی
میر کے کلام کی تعریف کی ذوق نے کہا کہ سودا کا کلام میر کے کلام سے بہتر
ہے مرزا نے کہا میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی
ہیں ۔

ایک دن مرزا پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے میر مہدی نے پاؤں دبانے
شروع کئے مرزا نے ہر چند منع کیا لیکن میر نہ مانے بلکہ کہنے لگے اگر آپ کو ایسا
ہی خیال ہے تو اجرت دید یجئے گا مرزا راضی ہو گئے جب میر مہدی پاؤں
داب چلے تو اجرت طلب کی مرزا نے کہا بھیا کیسی اجرت تم نے میرے پاؤں
دابے میں نے تمہارے پیسے دابے حساب برابر ہو گیا ۔

کسی نے مرزا سے پوچھا رتھ مذکر ہے یا مؤنث تو انھوں نے فرمایا اگر
رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوئی ہوں تو مؤنث اور اگر مرد بیٹھے ہوئے ہوں تو مذکر
سمجھا جائے ۔

ایک مرتبہ رمضان کا مہینہ گزرنے کے بعد مرزا بادشاہ سے ملنے کے

لئے گئے بادشاہ نے دریافت کیا۔ مرزا تم نے کتنے روزے رکھے مرزا نے جواب دیا پیرو مرشد "ایک" نہیں رکھا۔

مولوی امین الدین نے مرزا کی کتاب قاطع برہان کے جواب میں ایک کتاب لکھی جس کا نام قاطع قاطع رکھا۔ اس میں تہذیب اور اخلاق سے گرے ہوئے ناشائستہ الفاظ استعمال کئے گئے تھے مرزا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کسی نے پوچھا حضرت آپ نے قاطع قاطع کا جواب نہیں لکھا مرزا نے کہا اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے۔

دہلی سوسائٹی

یہ سوسائٹی ۱۸۶۵ء میں قائم ہوئی سوسائٹی کے سکریٹری ماسٹر منشی پیارے لال تھے یہ سوسائٹی اپنے جلسوں کی کارروائی اُردو زبان میں ایک رسالے کی شکل میں شائع کرتی تھی شہر کے اکثر معزز اور تعلیم یافتہ لوگ اس سوسائٹی کے ممبر تھے اس سوسائٹی میں مختلف فنون پر مضامین پڑھے جاتے تھے مرزا غالب بھی کبھی کبھی اس سوسائٹی کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔

۸ اگست ۱۸۶۵ء کے جلسہ میں مرزا نے اس سوسائٹی کے جلسہ میں اپنا ایک مضمون پڑھا عبارت نہایت رنگین اور مقفی لکھی عذر کا حال بیان کرتے ہوئے کہا۔

"تین برس کامل یہ حال رہا ہر شخص خستہ و بدحال رہا آب و ہوا کی ناسازگاری طرح طرح کی مصیبت۔ رنگ رنگ کی بیماری کلیجوں کا تپ حرارت سے سلگنا۔ گھروں میں جابجا آگ لگنا۔ ہوا شرارہ ریز۔ خاک شعلہ انگیز۔ دریا اور کوئیں کا پانی زہرآب۔ مینہہ کی پانی کی بوند گوہر نایاب۔ اساڑھ اور ساون، برسات کے دو مہینے تمام ہوئے ساون کے آخر اور بھادوں کے اول دو چار مہینہ ہوئے جس میں پانی اس قدر برسا کہ زمینداروں نے حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھولئے پایان کار کا حال خدا جانے خلق اس کے امراز کو کیا جاتی گرانی اور ارزانی ایک امر عام ہے مجھے خاص اپنے مدعا سے کام ہے بوڑھا ہوں ناتواں ہوں سچ اگر پوچھئے تو نیم جاں ہوں۔

ضعف نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میں کہاں اور بزم نشینی کہاں نظم و نثر میں وہ رنگینی کہاں سرکار کی خدمت گزاری کا شائق ہوں مگر اب صرف دو کام کے لائق ہوں اگر بذریعہ خط مجھ سے پوچھا جائے تو وہ لکھ سکتا ہوں جو میری رائے میں آئے یا اگر تحریر نظم و نثر اردو کا حکم آوے تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں آئندہ حکام کے پسند نہ ہو یا مقبول ہو جائے۔

مرزا غالبؔ نے اس سوسائٹی میں جو مضامین پڑھے۔ ایک مضمون کے متعلق ماسٹر پیارے لال سکریٹری دہلی سوسائٹی نے حوالہ دیتے ہوئے کہا " اس ملک کے آدمی احسان فروش نہیں۔ جو شخص ان سے ذرا سی محبت کرتا ہے یہ اس سے سہ چند بلکہ چو چند محبت کرنے کو تیار رہیں بقول جناب مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر۔

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے
جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
اخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور
ہے اصل تخم ہند سے اور اس زمین سے
پھیلا ہے سب جہاں میں یہ میوہ دور دور

یہ زمانہ مرزا غالبؔ کا آخری زمانہ تھا۔ کہ جب مختلف قسم کے امراض نے حملہ کیا۔ آخر کار ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں مرزا کی وفات ہوئی اور ۱۲ مارچ ۱۸۶۹ء کو جمعہ کے دن سوسائٹی کی طرف سے ایک جلسہ ہوا جس میں مرزا کی وفات پر اظہار رنج و غم کیا گیا۔

مرزا غالب کے کلام کی خصوصیات

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں مرزا کی ابتدائی تعلیم فارسی سے شروع ہوئی اور چونکہ قدرت کی طرف سے مرزا کو خاص قسم کا شاعرانہ دماغ عطا ہوا تھا اس لیے وہ گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے ایک فارسی غزل لکھی جس میں ہر شعر کے آخر میں "کرچہ" آتا تھا یعنی جس کی ردیف ہی "کرچہ" تھی۔ انھوں نے وہ غزل اپنے استاد شیخ معظم کو دکھائی یہ غزل دیکھ کر استاد نے کہا یہ ردیف تو کچھ اچھی نہیں ہے ایسے اشعار کہنے سے کیا فائدہ۔ مرزا یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ فارسی کے شعرائے متقدمین کا کلام اکثر ان کے مطالعہ میں رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن ظہوری کا ایک شعر ان کی نظر پڑ گیا جس کے آخر میں "کرچہ" تھا وہ دوڑے ہوئے شیخ معظم کے پاس گئے اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ لڑکا کسی دن میدان شاعری میں آفتاب کی طرح چمکے گا۔

ملا عبدالصمد کی فارسی کی تعلیم نے مرزا کی فارسی کی قابلیت میں چار چاند لگا دیے مرزا کو فارسی کے مشہور شاعر بیدل کا کلام بہت پسند تھا۔ اور وہ اکثر ان کے پیش نظر رہتا تھا اور وہ کلام ان کی قوت متخیلہ پر

چڑھ گیا تھا۔ لہٰذا مرزا اپنے فارسی کے کلام میں بیدل ہی کی پیروی کرتے تھے۔ جن میں فارسی کی مشکل ترکیبیں ہوتی تھیں اور اشعار بھی مشکل اور پیچیدہ ہوتے تھے۔ مشاعروں میں وہ اکثر فارسی کی غزلیں سناتے تھے۔

مرزا کو اپنے فارسی کلام پر خود بھی ناز تھا۔ چنانچہ ذوق کو مخاطب کرکے فارسی میں جو ایک شعر کہا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم میرے فارسی کلام کو دیکھو اس میں طرح طرح کے معانی نظر آئیں گے میرے اُردو کلام کو چھوڑو یہ تو میرا معمولی کلام ہے۔

مرزا اُردو میں تفریحِ طبع اور تفنّن کے طور پر شاعری کرتے تھے یا دوستوں اور ولی عہدِ سلطنت کے کہنے سے کوئی اُردو غزل کہہ دیتے تھے۔

لیکن مرزا کو کیا معلوم تھا کہ ان کا اُردو کلام ہی ان کی شہرت کا باعث بنے گا اور اس کلام کو لوگ بقول مولانا محمد حسین مصنّف آبِ حیات عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھریں گے۔

مرزا کا اُردو کا ابتدائی کلام فارسی کی مشکل ترکیبوں اور مشکل الفاظ سے پُر نظر آتا ہے۔

(۱)

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

(۲)
شب خمارِ چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا   تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
(۳) جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
(۴) آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
ہوائے سبزۂ گل آئینہ بے مہریٔ قاتل
(۵) کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ صد دل پسند آیا
مذکورہ بالا اشعار کا مطلب ملاحظہ فرمائیے ۔
۱۔ شاید صحرا اپنی وسعت کے باوجود حاسدوں کی آنکھ کی طرح تنگ تھا جس کو سوائے مجنوں کے کسی اور کی صحرا نوردی گوارہ نہ ہو سکی ۔
۲۔ اے ساقی رات کو میری مے نوشی کے شوق نے ایک قیامت برپا کر رکھی ہے خمار کی حالت میں جو انگڑائیاں لے رہا تھا ان انگڑائیوں نے تمام شراب خانہ پر احاطہ کر لیا تھا یعنی میری انگڑائیاں میخانہ میں رکھی ہوئی تمام شراب کو اپنے قبضہ میں لے لینا چاہتی تھیں ۔
۳۔ عشق اور محبت کے صحرا میں ایک قدم رکھتے ہی کائنات کی حقیقت کا ایک درس مل گیا ۔ یعنی یہی ایک ایسا راستہ ہے کہ جس کو اختیار کر کے تمام دُنیا کے اختلافات اور تفرقے دور ہو سکتے ہیں ۔
۴۔ اگرچہ حسن بے پروا ہے لیکن خود اس کی خواہش ہے کہ وہ خود اپنے

جلوے دیکھے اسی وجہ سے آئینہ اس کا زانوئے فکر بن گیا ہے کہ اسے دیکھ کر وہ اپنے حسن کو اور زیادہ پرکشش بنانے کے لئے کسی نئے انداز کا اضافہ کرنا چاہتا ہے۔

(۵) سرخ رنگ کے پھول جو ہوا سے ملتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بسمل خون میں لوٹ رہے ہیں ہمارے محبوب کو جو پھولوں کی سیر کا شوق پیدا ہوا ہے وہ اس ظالم کی بیدردی کو ظاہر کرتا ہے اس لئے کہ اسے خون میں تڑپتے ہوئے بسمل لوگوں کو دیکھنے کا شوق ہے اور شوق پھولوں کے ہوا میں ملنے سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔

مرزا کے ابتدائی کلام کے متعلق لوگ کیا ہی خیال ظاہر کریں لیکن مرزا کا راستہ تمام شاعروں سے الگ نظر آتا ہے وہ یہی طرز کے موجد ہیں اس مشکل پسندی اور پیچیدہ بیانی نے آگے چل کے ایک نہایت آراستہ پیراستہ راستہ اختیار کیا حقیقت یہ ہے کہ اس مشکل پسندی اور پیچیدہ بیانی ہی نے اسداللہ خاں کو غالب بنایا ان کے کلام میں جو خصوصیات ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلی خصوصیت: مرزا کے کلام میں جا بجا فارسی کی نئی نئی ترکیبیں ملیں گی جن کو اساتذہ متقدمین نے یا تو استعمال نہیں کیا اور اگر کیا تو بہت کم۔ لیکن چونکہ اُردو زبان مرزا کے خیالات کی ترجمانی کے لئے کافی نہ تھی اس لئے مجبوراً انھوں نے فارسی کی ترکیبیں اُردو کلام میں استعمال کیں۔ یہی نہیں بلکہ ضرورت کے مطابق خود بھی بہت

سی ترکیبیں اپنی طبیعت سے خود ایجاد کیں۔

دامِ شنیدن۔ (۱)

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

آتشِ خاموش۔ (۲)

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

جوہرِ اندیشہ۔ (۳)

عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
اِک خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

خانہ زادِ زلف۔ (۴)

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

وادیِ خیال۔ (۵)

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

جنتِ نگاہ، فردوسِ گوش۔ (۶)

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

دعوتِ مژگاں۔ (۷)

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

ان اشعار کا مطلب ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ لوگوں کی عقل میرے اشعار کے معنی کو سمجھنے کی کتنی ہی کوشش کرے لیکن میرے کلام کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

۲۔ محبت کی پوشیدہ سوزش سے میرا دل بے محابا جل کر خاک ہو گیا

اندر ہی اندر آگ اس طرح سلگتی رہی کہ کسی کو بھی خبر نہ ہو سکی۔

۳۔ ہم اپنے خیالات کی گرمی کا حال کہاں جا کر بیان کریں ذرا وحشتِ صحرا کا خیال ہی کیا تھا کہ خیالات کی گرمی سے صحرا میں آگ لگ گئی۔

۴۔ ہم اپنے محبوب کی زلفوں کے غلام اور اس کے وفاداری کے پابند ہیں اس لئے زنجیروں میں جکڑے جانے یا قید خانہ کی تکالیف سے بالکل نہیں گھبراتے۔

۵۔ میں وادیٔ خیال کے راستہ کو مست اور بے خود لوگوں کی طرح طے کر رہا ہوں تاکہ مدہوشی کی حالت میں راستہ بھول جاؤں اور پھر واپس نہ آسکوں۔

۶۔ ساقی کے چلنے کا لطف نگاہوں کو جنت کا سماں دکھاتا ہے اور چنگ کی سُریلی آواز کانوں کو بہشت کے نغموں کا لطف دے رہی ہے۔

۷۔ میں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو پھر جمع کر رہا ہوں تاکہ مژگانِ یار کی دعوت کر دوں اس لیے کہ مژگانِ یار کی دعوت کئے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔

دوسری خصوصیت مرزا کے کلام میں جدتِ بیان معنی آفرینی بہت زیادہ ہے تشبیہہ۔ استعاروں اور کنایوں سے وہ اپنے کلام کو مزین کرتے ہیں۔

(۱)

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

دمِ عیسیٰ سے لوگ زندہ ہوتے تھے لیکن اس شعر میں دمِ عیسیٰ ہی کو اپنی موت کا سبب بیان کیا ہے۔ عیسیٰؑ کے وہ الفاظ جن سے لوگوں کو زندگی ملتی ہے میری موت کا سبب بن گئے جیسے ہی اُنھوں نے مجھے اُٹھنے کے لئے کہا۔ میں اتنا کمزور ناتوان تھا کہ اِن کے الفاظ کی تاب نہ لاکر مر گیا۔

(۲)

دل گزرگاہِ خیال مے و ساغر ہی سہی　　گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

دل کو شراب اور ساغر کے خیال کے گزرنے کا اور نفس کو تقویٰ کا راستہ بنایا ہے فرماتے ہیں اگر ہمارا سانس پرہیزگاری کی منزل کا راستہ نہ بن سکا تو کیا مضائقہ۔ شراب اور پیالے کا خیال تو دل کے راستہ سے گزر رہا ہے یعنی اگر ہم پارسا نہ بن سکے تو رند تو بن سکتے ہیں۔

(۳)

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام　　مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ بادیاں

اس شعر میں سورج کو چراغ رہ گزر سے تشبیہہ دی ہے کائنات کے تمام اجزا فنا ہونے والے ہیں اور یہ سورج جو اتنا مستقل اور عظیم الشان نظر آتا ہے راستے کے چراغ کے مانند ہے کہ خدا جانے فنا کی ہوا سے کب بجھ جائے۔

(۴)

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا　　ہر کوئی درماندگی میں نالے سے لاچار ہے

جب پانی سے آگ بجھاتے ہیں تو اُس میں سے آواز نکلتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ درماندگی اور مصیبت کے وقت ہر ایک کے منہ سے فریاد

کی آواز نکلتی ہے۔

تیسری خصوصیت مرزا کے کلام میں متانت اور سنجیدگی کے علاوہ شوخی اور ظرافت بھی ہوتی ہے اور یہ خوبی مرزا کو دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔

(۱) میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں　　گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

یعنی اگر میں نے شراب سے توبہ کر لی تھی تو ساقی کو چاہیئے تھا کہ وہ زبردستی مجھے پلا دیتا تاکہ بزمِ مے سے تشنہ کام تو نہ آتا۔

(۲) واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو　　کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

واعظ کہتے ہیں کہ جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو جنت میں "پاک شراب" ملے گی حضرت غالب واعظ سے مخاطب ہو کے کہتے ہیں کہ جب نہ تم خود پی سکتے ہو نہ کسی کو پلا سکتے ہو واعظ تمہاری شرابِ طہور کے کیا کہنے۔

(۳) دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی　　ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

دیکھنا غالب سے جھگڑا مت کرنا اگرچہ وہ بظاہر لا مذہب نظر آتا ہے لیکن پوشیدہ طور پر ولی ہے کہیں وہ برا بھلا نہ کہہ بیٹھے۔

(۴) کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ　　پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

یہ تو معلوم نہیں کہ حضرت واعظ جو دوسروں کو نصیحت کرتے تھے مےخانہ میں کیوں گئے۔ البتہ اتنا جانتے ہیں کہ ادھر ہم میخانے کے دروازے سے نکلے اور ادھر وہ حضرت داخل ہوئے۔

(۵) میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی　　سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

فرماتے ہیں ہم نے اپنے محبوب سے کہا کہ اس رقیب کو آپ نے یہاں کیوں بلایا ہے اس کو اپنی محفل سے اُٹھا دیجئے۔ تو اس نے بجائے رقیب کو اُٹھانے کے مجھے کہا اس طرح " کہ کر اپنی محفل سے اٹھا دیا۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

فرماتے ہیں جب قبر میں نکیرین (فرشتے) مجھ سے سوال و جواب کرنے آئیں گے تو گھبرا کے خود ہی بغیر سوال و جواب کئے بھاگ جائیں گے اس لئے کہ میرے منہ سے کل رات کے شراب پینے کی بو آ رہی ہو گی۔

چوتھی خصوصیت مرزا کے اشعار کا طرز بیان بالکل انوکھا اور نرالا ہوتا ہے بادی النظر میں تو اس سے کچھ اور معنی نکلتے ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو دوسرا نہایت لطیف مطلب اور نکل آتا ہے اور یہ خصوصیت مرزا کو دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔

اور دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

یعنی اگر ہم کچھ اور دن زندہ رہے تو ہم نے فیصلہ کیا ہے۔

۱۔ ترکِ محبت کی کوشش کریں گے۔

۲۔ یا اس زندگی کی کشمکش سے گوشہ نشینی اختیار کر لیں گے۔

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

۱۔ معشوق نے ایک دم جلوہ دکھا کر ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا اور جلوہ دکھا کر بغیر بات کئے چلے گئے اور ہمیں بات کرنے کی جو آرزو تھی وہ باقی رہ گئی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر اپنا جلوہ دکھا۔ بس ان کی آنکھوں

کے آگے اک بجلی سی کوند گئی اور تابِ نظارہ نہ لا کر بیہوش ہو گئے۔ ایسا جلوہ دکھانے سے کیا فائدہ وہ کچھ بات بھی کرنا چاہتے تھے جو مدہوشی کی وجہ سے نہ کر سکے۔

(۴) در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا   جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

۱۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ آج میں تمہارے ہی گھر پر رہوں گا لیکن جتنی دیر میں میں نے اپنا لپٹا ہوا بستر کھولا وہ غائب ہو چکا تھا۔

۲۔ میں خانہ بدوش اپنا بستر ساتھ لئے ہوئے محبوب کے دروازہ پر پہنچا اس نے میری پریشانی کو دیکھ کر کمال مہربانی سے اپنے دروازہ پر پڑا رہنے کو کہا لیکن خدا جانے اسے کیا ہو گیا کہ جتنی دیر میں میں نے اپنا لپٹا ہوا بستر کھولا وہ اپنے کئے موعدہ سے پھر گیا۔

پانچویں خصوصیت مرزا معمولی خیال اور معمولی مضمون کو بھی تشبیہ استعاروں کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ اس میں انوکھاپن پیدا ہو جاتا ہے اور ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس سے کلام میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔

(۱) شبِ ہجر کاٹنے سے نہیں کٹتی۔ رات بھر نیند نہیں آتی تکلیف ہوتی ہے۔ معمولی مضمون ہے لیکن مرزا اس مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ   صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اے دوست تو مجھ سے ہجر کی تکالیف اور سخت جانی کا حال مت پوچھ میرے لئے ہجر کی شب گزارنے میں جو تکلیف ہوئی وہ اتنی سخت تھی جو فرہاد کو جوئے شیر لانے میں بھی نہ ہوئی۔

(۲) فرہاد اپنی ناکامی پر تیشہ سر میں مار کر مرگیا اس کو اس انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں ۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

فرماتے ہیں فرہاد کی موت تیشہ کے بغیر نہ ہو سکی یعنی اُس کا عشق اگر کامل ہوتا تو شیریں کی موت کی خبر سن کر بغیر تیشہ کے ہی مرجاتا۔ لیکن وہ دُنیا کے رسم و رواج میں مقید تھا، اس لئے تیشہ مار کر ہی مرنا پڑا

(۳) عاشق کے آہ و نالے میں اثر نہیں ہوتا اس کی وجہ لکھتے ہیں :۔

وہ ستمگر دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

میں دل پر کیا بھروسہ کروں وہ تو میری جان کے دشمن محبوب سے مل گیا ہے۔ اس لئے کہ میں اپنے دل سے آہ نکالتا ہوں تو محبوب پر اُس کا اثر ہی نہیں ہوتا۔

(۴) آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

معشوق کو غرور تھا کہ وہ کسی پر بھی عاشق نہ ہوں گے لیکن آئینہ میں جیوں ہی اپنی شکل دیکھی تو اپنے اوپر ہی فریفتہ ہو گئے اور ان کا وہ غرور خاک میں مل گیا ۔

(۵) وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

حضرت خضر نے آبِ حیات پی کر حیاتِ جاوید حاصل کر لی ہے اور وہ اب بھی بھولوں کو راستہ بتاتے ہیں ۔

اے خضر اصل میں زندگی تو ہمیں حاصل ہے کہ دُنیا ہمیں جانتی ہے اور ہم ہر جگہ مشہور ہیں لیکن آپ حیاتِ جاوید حاصل کر کے چھپے چھپے پھرتے ہیں ۔ تو یہ زندگی کس کام کی ۔

(۹) تا بعث نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں　　　مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

ابھی میں محبت کے میدان میں مبتدی تھا اور میرے پریشان خیالات بھی مرتب نہ ہوئے تھے کہ میں طریقۂ محبت سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا اور عشق و محبت کے مضمون پر کتابیں مرتب کر رہا تھا۔

مذکورہ بالا خصوصیات کے علاوہ مرزا نے عشق، تصوف، رندی، بیچارگی، خودداری، غم موت، یاس، شراب، رقابت، دشمنی، اخلاق پر لاجواب اشعار کہے ہیں۔

عاشقانہ

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار　　　لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ　　　اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو　　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　　میری وحشت تری شہرت ہی سہی

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا　　　تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے　　　عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　　مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے　　　حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے　　　جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب　　　کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آئے

جب اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

شوخی اور ظرافت

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

ناصح

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

موت

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

فلسفۂ رنج و غم

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

قنوطیت (یاس)

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

سوز و گداز

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

حرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

نامہ کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

خمریات

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

تصوف

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

جلادے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں آئے

ہے کائنات کی حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اخلاق

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے کہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

رقابت

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے — آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں
غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے — سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم — میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف — عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے — ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہئے
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

آزادی و خودداری

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا۔

درد منتِ کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

سر کی ہے قدر تو ہر پا سے نیچے
منتِ سایۂ دیوار نہ کھینچ

دشمنی

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

دوستدار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم
آہ نارسا دیکھی نالہ نارسا پایا

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

شکایت ابنائے زمانہ

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

نیند

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

پاسباں

ے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دُعائیں صرف درباں ہو گئیں

و در و دیوار اک گھر سا بنانا چاہئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

شب غم

ں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ں اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر کو ہی رہے گا دیدۂ اختر کھلا

دِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

ہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائے گا

یادِ رفتگان

ب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

اندہ رہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تونے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

فضیلتِ انسانی

گر نی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

متفرق اشعار

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہگزر ہے کیا کہیے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہیے

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

مرزا غالب کے کلام پر

تنقید کرنے والوں پر تنقید

حضرت جوش ملسیانی کی شرح دیوانِ غالب پر تنقید

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بعض شارحین غالب کے اشعار کا مطلب لکھتے وقت تو اُن کی تعریف میں بہت زیادہ رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ اور شرح لکھتے وقت خود وجد کرنے لگتے ہیں لیکن جب وہ دوسرے شعراء سے غالب کا موازنہ کرتے ہیں تو ان کو غالب کے کلام میں کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ خاص کر ذوق اور مومن کے کلام کو غالب کے کلام سے برتر اور اعلیٰ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُن کے کلام کو غالب کے کلام پر ترجیح دیتے ہیں۔

یہ بات اور بھی حیرت انگیز ہے کہ جو لوگ شرح دیوان غالب لکھکر غالب کے نام سے فائدہ اٹھار ہے ہیں وہی غالب کو ذوق اور مومن سے کم تر درجے کا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں پر ان کی قابلیت کا سکہ جم جائے اور لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ تنقید نگار غالب سے زیادہ قابل ہے اور اچھا شاعر ہے ۔

شارحین وعادیں حضرت حالی کو کہ جنھوں نے اوّل غالب کے اشعار کی شرح لکھکر اور خود غالب سے ان کے اشعار کا مطلب دریافت کرکے ان کی مشکل کو آسان کردیا ورنہ غالب کے اشعار کی شرح لکھنا یا ان کے اشعار کو اچھی طرح سمجھنا کوئی آسان بات نہ تھی ۔

حضرت جوش ملسیانی نے دیوان غالب کی شرح لکھی ہے وہ ہر لحاظ سے ایک نہایت عمدہ شرح ہے ۔ اور طلبہ کے لیے نہایت مفید ہے حضرت جوش اشعار کا مطلب لکھتے وقت خود غالب کی خوبیوں کے قائل ہوتے ہیں اور واہ وا کے نعرے بلند کرنے لگتے ہیں لیکن ذوق اور مومن سے مقابلہ کرتے وقت وہ غالب کی خوبیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور انھیں وہی خوبیاں ذوق اور مومن میں نظر آنے لگتی ہیں اور ان کو غالب کا دامن ان خوبیوں اور اوصاف سے تہی نظر آتا ہے ۔

غالبؔ اور ذوقؔ کا موازنہ کرتے ہوئے جوشؔ ملسیانی صاحب فرماتے ہیں۔

"آج کل غالب پرستی کا دور دورہ ہے مرزا کے معتقدوں کی کثرتِ رائے نے جوشِ عقیدت سے بھرپور ہو کر زمانہ بھر کی شاعرانہ خوبیاں ایک ہی شخص کی جھولی میں ڈال دی ہیں اردو زبان کا کوئی شاعر ان کی نظر میں نہیں جچتا بعض مہمل اشعار کو بھی سحر نگاری ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر یہ بڑی بے انصافی کی بات ہے کہ سب کے حقوق چھین کر ایک شخص کو دیدیے جائیں۔ اور جانبداری کی انتہا یہاں تک پہنچ جائے کہ واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے مرزا کو حکیم فلاسفر۔ قوم پرست یا محبِ وطن بھی ثابت کیا جائے۔

اس قسم کے اصحاب جب کبھی غالبؔ اور ذوق کا موازنہ کرتے ہیں انھیں ذوق میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی ذوق کو غالبؔ کا ناکام مقلد کہنے میں بھی دریغ نہیں کرتے حالانکہ دونوں کی سخن گوئی کا عالم اتنا مختلف ہے کہ تقلید کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ذوق پر سب سے بڑا یہ اعتراض ہوتا ہے کہ وہ جذبات نگاری جانتا ہی نہیں حالانکہ یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔

مذکورہ بالا عبارت سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ۔

۱۔ جوش صاحب غالبؔ کی شاعرانہ خوبیوں کے قائل نہیں ہیں۔

۲۔ ان کے بعض اشعار کو مہمل جانتے ہیں۔

۳۔ مرزا غالبؔ کو حکیم، فلاسفر نہیں سمجھتے۔

۴۔ ذوقؔ کو غالبؔ کا مدِمقابل سمجھتے ہیں۔

(۱) غالبؔ کی شاعرانہ خوبیوں کے تمام اہلِ کمال اور ادیب معترف ہیں ان کے تمام اشعار شاعری کی گوناگوں خوبیوں سے بھرپور ہیں جن کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) مرزا کے جو اشعار شارحین کی سمجھ میں نہیں آتے وہ ان کو مہمل کہہ دیتے ہیں طباطبائی نے بھی اکثر اشعار کو مہمل کہا ہے طباطبائی کا جواب تو کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمایئے، لیکن جوشؔ صاحب نے جو طباطبائی کی نقل کرتے ہوئے غالبؔ کے نو اشعار کی فہرست دی ہے ان کے متعلق وہ لکھتے ہیں

"اس قبیل کا کچھ اور انتخاب بھی ہو سکتا ہے یہ اشعار مہمل تو نہیں ہیں لیکن اہمال کی حد کو ضرور پہنچتے ہیں اگرچہ شارحین اور معتقدان غالبؔ نے ان اشعار کے معنی اور مطلب بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ضرورت سے زیادہ تکلف اور کھینچا تانی سے کام لینے کے باوجود ذوق سلیم اور فہم صحیح کو اطمینان نہیں دلا سکے۔ غالبؔ کے مہمل اشعار یہ ہیں:"

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا ۔۔۔ تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

شبِ خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا ۔۔۔ تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

شب کو وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

ہم سے رنجِ بیتابی، کس طرح اٹھایا جائے
داغِ پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بدنداں ہے

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

اس اعتراض کا جواب ہم جوش صاحب ہی کی تحریر سے زیادہ مناسب سمجھتے ہیں اپنی شرح کے صفحہ ۵۰ پر فرماتے ہیں۔

"اہلِ نظر کا یہ قول بالکل درست ہے کہ غالب کے کلام سے خواص ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں وجہ یہ ہے کہ کلام کا بیشتر حصہ عام مذاق اور معمولی فہم کی دسترس سے بالاتر ہے خاص کر وہ حصہ جو بیدل کی طرز اور پیروی سے تعلق رکھتا ہے اور جس میں فارسیت اور تعقیدِ معنوی پائی جاتی ہے بہت سے ایسے اشعار ہیں کہ ان پر اردو کا اطلاق بھی مشکل سے ہو سکتا ہے عجیب و غریب اور نادر تشبیہات دور دور کے نامانوس استعاروں کی طلسم بندی کو خاص مذاق کے آدمی ہی سمجھ سکتے ہیں۔"

جوش صاحب نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ غالب کے کلام سے خواص ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں ان کا کلام عام مذاق اور معمولی فہم کی دسترس سے باہر ہے۔ یعنی غالب کا کلام سمجھنے کے لئے بہت زیادہ اہلیت اور قابلیت

کی ضرورت ہے تو اگر کسی نااہل کی سمجھ میں ان کا کلام نہیں آتا تو یہ اس کی فہم و ادراک اور اہلیت کا قصور ہے۔ حضرت غالبؔ خود فرماتے ہیں میرے اشعار کا سمجھنا آسان نہیں۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بعض شعرا نے اُس زمانے میں بھی اعتراض کیا تھا کہ اُن کے کلام میں معنی نہیں ہوتے اس پر غالب نے فرمایا :-

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

جس عظیم ترین شاعر نے ہمیں اپنا موجودہ دیوان دیا وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ مہمل شعر کیا ہوتا ہے۔ حضرتِ غالب اپنے اشعار کے متعلق خود لکھتے ہیں۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

مولانا حالی۔ حسرت موہانی۔ بیخود دہلوی وغیرہ شارحین نے تو ان اشعار کو مہمل نہیں سمجھا۔ جوش صاحب ان اشعار کو مہمل سمجھتے ہیں تو انھوں نے ان کی شرح کیوں لکھی۔

(۳) مرزا غالب کو حکیم اور فلاسفر تو خود جوش صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے فرماتے ہیں کہ اُن کی شاعری تمام تر حکمت اور فلسفہ سے بھری ہوئی ہے آپ نے صفحہ ۵۳ پر خود ہی تحریر فرمایا ہے۔

"تصوف کی طرح فلسفۂ عشق و محبت بھی مرزا کی شاعری کا ایک خاص میدان ہے اور اس قسم کے مضامین کی بھی ان کے کلام میں فراوانی ہے مگر وہ فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں کہے گئے ہیں مرزا کی شاعری کا یہ وصف وہ وصف ہے جو ان کی وفات کے بعد ان کے کلام کی بے مثل مقبولیت اور شہرت کا باعث ہوا۔"

چنانچہ اس ضمن میں جوش صاحب نے غالب کے ۱۷ اشعار دیئے ہیں اور لکھا ہے :۔

"اسی قسم کا اور بہت سا انتخاب آسانی سے ہو سکتا ہے یہ حکیمانہ انداز مرزا کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔"

کیوں جناب یہ آپ نے آنکھیں بند کر کے مرزا کو حکیم اور فلاسفر کیوں لکھ دیا اور اگر لکھ دیا تھا تو اعتراض کیوں کیا۔

(۴) جوش صاحب ذوق کو مرزا کا مدِ مقابل بلکہ شعر گوئی میں مرزا سے بہتر سمجھتے ہیں۔

اوّل تو ذوق اور مرزا کا مقابلہ کرنا ہی سخت بے انصافی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ذوق اور مومن مرزا کے ہمعصر شاعر تھے یہ صحیح ہے کہ ذوق قصیدہ گوئی میں اردو زبان کے قا[illegible]نی ہیں ان کا کلام سادہ اور بے تکلف ہوتا ہے اکثر وہ اخلاقی شعر لکھتے ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے استاد تھے لیکن جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے ذوق اور غالب کا کیا مقابلہ خود جوش صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"یوں تو مرزا کی غزل میں وہ تمام عناصر کم و بیش پائے جاتے ہیں جو غزل گوئی کے دائرے میں سمجھے جاتے ہیں مثلاً معاملہ بندی، زہد و تقویٰ کی تضحیک، رندی، راز و نیاز، شکایت زمانہ، اخلاق خودداری، تصوف فلسفہ، عشق و محبت، سوز و گداز، درد محبت۔ رشک و یاس و حسرت، آہ و فغاں، زار و نالی وغیرہ مگران پانچ عنصروں کی فراوانی ہے فلسفہ و عشق و محبت، تصوف، سوز و گداز، درد و غم، یاس یعنی قنوطیت، رندانہ مضامین ان پانچ اقسام کے مضامین کو مرزا کی شاعری کا میدان سمجھنا چاہیئے شوخیٔ طبع جو مرزا کی طبیعت میں قدرت نے ودیعت کی تھی ہر قسم کے کلام کی زینت بنی ہوئی ہے۔ اُمید کے مضامین یعنی رجائیت مرزا کے کلام میں ناپید ہے"

گویا غزل گوئی اور شاعری کے لئے جن اوصاف، جذبات اور خوبیوں کی ضرورت ہے وہ مرزا کی شاعری میں بدرجہ اتم و کمال موجود ہیں اور دوسرے شاعروں کو ان میں سے بہت کم حصہ ملا ہے۔

جوش ملسیانی صاحب غالب اور ذوق کے کلام کا موازنہ کرتے ہیں۔

حضرت غالب نے ایک غزل لکھی

نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے　　رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

سات اشعار کے بعد اسی زمین میں سات اشعار اور ہیں جو تجمل حسین خاں صاحب کی تعریف میں کہے گئے ہیں ۔

غزل کے اشعار یہ ہیں :-

(۱) نوید امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے — رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

(۲) بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کے لئے

(۳) وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

(۴) رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک — بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

(۵) فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں — درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

(۶) مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

(۷) گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

حضرت ذوق نے بھی اس کے جواب میں اسی زمین میں ایک غزل لکھی :-

(۱) نہیں ثبات بلندی میں عز و شاں کے لئے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے

(۲) . . . . — . . . .

(۳) اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس — بہشت ہے ہمیں آرامِ جاوداں کے لئے

(۴) . . . . — . . . .

(۵) وہ مول لیتے ہیں جب دم کوئی نئی تلوار — لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لئے

(۶) صبا جو آئی خس و خارِ گلستاں کے لئے — قفس میں کیونکر نہ پھڑکے دلِ آشیاں کے لئے

(۷) . . . . — . . . .

ذوق نے شعر نمبر ۲ و شعر نمبر ۴ و نمبر ۷ کا تو جواب ہی نہیں لکھا صرف چار اشعار لکھے ہیں جن کی تعریف میں ملیبا نی صاحب نے انتہا کر دی ہے۔ فرماتے ہیں :-

مرزا کے مطلع میں معنی آفرینی تو بہت ہے مگر مضمون نیچرل نہیں یعنی حقیقت سے بعید۔ ذوق کا مضمون اخلاقی اور انتباہی حیثیت کا ہے اور دوسرے مصرع میں جو دلیل پیش کی ہے اس میں بھی حقیقت کی ترجمانی ہے قابل داد ہے آسمان کا اوج بھی نظر آتا ہے اور اُفق میں پستی بھی نظر آتی ہے۔

شعر نمبر ۳۔ مرزا کے مضمون میں شوخی اور بے باکی ہے اور اسی کو شعر کی روح کہنا چاہیے مگر ذوق نے حقیقت کو ظاہر کرنے کی کوشش میں معنی آفرینی کی داد دی ہے اور اس کی یہ کوشش بہت کامیاب ہے بیان کی بے تکلفی دونوں کے یہاں برابر ہے۔

شعر نمبر ۵۔ غالب کا یہ شعر دراز دستی کا مرہون منت ہے اس میں معنی آفرینی کا حق تو ادا کیا ہے گر مضمون میں تصنع کا رنگ پیدا ہو گیا ہے ذوق نے اس قافیہ میں کسی قسم کا تکلف یا تصنع سے کام نہیں لیا اور اس بے تکلفی سے باندھا ہے کہ گویا سامنے کا مضمون تھا نزاکت خیال کو معیار قرار دیا جائے تو غالب کا شعر قابل ترجیح ہے اور تصنع یا آوردگی کی بجائے بے تکلفی کو پسند کیا جائے تو ذوق کا شعر خوب ہے۔

شعر نمبر ۶۔ اگرچہ ذوق کے شعر میں یہ لطف ہے کہ اس نے مصرع

اوّل کی ردیف کو فعل کی صورت میں استعمال کیا ہے اور دونوں ردیفوں میں تنوّع پیدا کر دیا ہے یعنی صاحب گلستاں کے خس و خار لئے ہوئے ادھر آئی مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا کا شعر لفظاً و معناً بہت فوقیت رکھتا ہے اور تمثیل نے اس شعر میں جو خوبی پیدا کر دی ہے وہ محتاج توصیف نہیں۔

باقی اشعار چونکہ ہم قافیہ نہیں ہیں اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان میں جو جو اشعار خاص طور پر قابل ستائش ہوں انھیں نقل کر دیا جائے مرزا کی غزل میں مدحیہ اشعار کو چھوڑ کر صرف تین شعر اور ہیں ان میں یہ شعر بہت ہی لاجواب ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

(اب یہاں سے ذوق کی مدح سرائی شروع ہوتی ہے)

ذوق کی غزل کے وہ منتخب اشعار دیکھئے۔ جو ہم قافیہ نہ ہونے کی وجہ سے موازنہ میں شامل نہیں ہو سکے۔

۱۔ نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے

۲۔ الٰہی کان میں کیا اُس صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے

۳۔ جو پاس مہر و محبت کہیں یہاں بکتا
تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لئے

۴۔ بیان درد محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے

جوش ملسیانی صاحب ان اشعار کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

پہلے شعر میں زورِ بیان کے علاوہ راستی کے لئے عصا اور سیف

ان دونوں لفظوں کی تلاش حدِ توصیف سے بالاتر ہے وہ یہ ہے کہ راست کے معنی سیدھا بھی ہیں اور عصا اور سیف میں یہ وصف موجود ہے دوسرے شعر میں محاورہ کی بندش وجدانی کیفیت رکھتی ہے اور اس میں جو معنوی تضاد کا لطف ہے یعنی اثبات میں نفی کے معنی پیدا کرنا اور حقیقت کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔ اس کی داد کہاں تک دی جائے تیسرے شعر میں لفظ مہرباں میں جو طنز ہے وہ لطف سے خالی نہیں چوتھا شعر تو اُردو شاعری! ورحقیقت ذوق دونوں کے لئے فخر و مباہات کا سرمایہ ہے شاید کسی اُردو شاعر کا دیوان اس شعر کا جواب دے سکے۔ درد محبت کا مزہ دل نے اُٹھایا ہے مگر وہ زبان کا کام نہیں ہو سکتا ہے بیان کرنا زبان کا کام ہے مگر اس نے یہ مزہ نہیں اُٹھایا اور وہ دل کا کام نہیں دے سکتی۔ تو مزہ اُٹھانے بغیر کیا کرے گی اِسے تو دل ہی بیان کر سکتا ہے مگر اس میں گویائی کی طاقت نہیں پس دردِ محبت بیان ہو تو کس طرح ہو۔ اس شعر کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے تلسی داس کے اس شعر کو دیکھئے۔

شیام گور کم کہوں بکھانی
گرا انین نین بن بانی

سیتا جی کی سہیلیوں نے رام چندر جی اور لچھمن جی کا حسن و جمال دیکھا تو وہ اپنی مالکہ کے پاس آکر جو کچھ کہنے لگیں اور جو توصیف بیان کی اسے تلسی داس نے سہیلیوں کی زبان سے اس شعر میں بیان کیا ہے۔
شیام۔ حسن ملیح۔ گور۔ حسن صبیح۔ (مراد لچھمن جی سے) کم بمعنی کس طرح۔

بکھانی ۔ بمعنی توصیف ۔ رگرا۔ بمعنی زبان۔ انین ۔ بمعنی اندھی۔ نین۔ بمعنی آنکھ۔ بانی. گویائی۔

یعنی اس حسن ملیح اور صبیح رکھنے والے نوجوانوں کے حسن کی تعریف کس طرح کروں زبان اندھی ہے اس نے دیکھا ہی نہیں تو بیان ہی کیا کرے گی دیکھا آنکھ نے ہے مگر اس میں گویائی نہیں دوسرے مصرعہ کے چار لفظوں میں معنی کا جو وفتر بند کر دیا ہے وہ بھی قابل دید ہے اس شعر کی عظمت پر خیال رکھ کر اگر ذوق کا شعر زیر بحث پرکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ اس شعر پر مصنف جس قدر بھی ناز کرے کم ہے۔

اگر اچھے اشعار کی تعداد کو ایک معیار تصوّر کیا جائے ۔ تو ذوق کی غزل بلاشبہ فوقیت کے درجے کو پہنچتی ہے ورنہ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں باکمال اپنی اپنی جگہ اپنے اپنے رنگ میں فرد ہیں۔ آشیاں امتحاں اور پاسباں کے قوافی میں اگر مرزا بازی لے گئے ہیں تو جادواں جواں، اذاں اور زباں کے قوافی ذوق کا حصّہ بن گئے۔

آگے چل کر ذوق کی تعریف میں لکھتے ہیں :۔

" اخلاقیات، زبان کی صفائی ، بیان کی سادگی سلاست اور محاورہ بندی میں ذوق کو امتیازی درجہ حاصل ہے محاورہ بندی میں تو اس کا مدِ مقابل کوئی نہیں اور زبان کے محاورات کو اس طرح باندھتا ہے کہ اس سے بہتر محل استعمال خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔

آپ نے جوش ملسیانی کی زبانِ قلم سے ذوق کی تعریف تو سُن لی مومن نے بھی اسی انداز میں ایک غزل لکھی جس کا حوالہ حامد حسین قادری پروفیسر سینٹ جانس کالج آگرہ نے اپنی کتاب تاریخ و تنقید میں دیا ہے ان تینوں باکمالوں کا موازنہ آپ کو اسی کتاب میں آگے کے صفحات میں ملے گا اس موازنہ سے آپ کو تینوں عظیم ہستیوں کی شاعرانہ خوبیوں کا اندازہ ہو جائے گا۔

جوش ملسیانی صاحب سے درخواست

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ شعر کی تشریح نہایت عمدہ کرتے ہیں اور اس میں وہ معنی پیدا کرتے ہیں کہ ہر بات پر داد دینے کو طبیعت چاہتی ہے اب آپ سے درخواست ہے کہ آپ دیوانِ ذوق اور دیوانِ مومن کی بھی شرح لکھیں تاکہ اہل ادب پر ان بزرگوں کی دوسری شاعرانہ خوبیاں اور شاعرانہ کمالات ظاہر ہو سکیں لیکن دیکھیے شرح لکھتے وقت ذوق کے ان اشعار کی خوبیاں ضرور بیان کیجیے جو ذیل میں دیوانِ ذوق سے اخذ کر کے لکھے جاتے ہیں۔

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق
نامرد مرد، مرد جواں مرد بن گیا

اس لعل و لب کے ہم نے لئے بوسے اس قدر
سب اُڑ گئی مسی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد

دیکھنا اے ذوق ہونگے آج پھر لاکھوں کے خون
پھر جمایا اس نے لعلِ لب پہ لاکھا پان کا

ایک پتھر چومنے کو شیخ جی کعبے گئے
ذوق ہر بت قابلِ بوسہ ہے اس بتخانہ میں

جو بیٹھے اُسکو تھام کے دل بیٹھ جائے ذوق
جب ناز سے کھڑا ہو وہ رکھ کر کمر پہ ہاتھ

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے
نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

نشے میں ہوش کسے جو گنے حساب کرے
جو تجھ کو دینے ہیں مجھ سے بلا حساب تو دے

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

تم بھی ملکر نہ غرفہ سے نکالا منہ کرو
اور نہیں گر مانتے تو جاؤ منہ کالا کرو

مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا
کافر کی دیکھو شوخی گھر میں خدا کے مارا

حضرت طباطبائی نے غالب کے مذکورہ بالا اشعار "نوید امن ہے" کی جو تشریح کی ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں وہ ہم ناظرین کی تفریح طبع کے لئے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۔ معشوق کی بیداد نے بیدادِ فلک سے بے خوف کر دیا کوئی ستم اٹھا ہی نہ رکھا اب نیا اندازِ ستم آسماں کو کہاں سے ملے گا آتش کہتے ہیں

گردشِ چشمِ بتاں سے خاک میں ہم مل گئے
حوصلہ باقی فلک کو رہ گیا بیداد کا

لفظ طرز پہلے مؤنث تھا اور دلی میں اب بھی مؤنث ہے مگر لکھنؤ میں عام محاورہ اس کی تذکیر کا ہے۔ ہاں چند غزل گو جو زبان میں قیاس کیا کرتے ہیں وہ اب بھی مؤنث باندھتے ہیں لیکن خلاف محاورہ معلوم ہوتا ہے کانوں کو۔ میرا شعر ہے۔

طرزِ دکھلا دے اس کی قامت کے
پاؤں پڑتا ہوں میں قیامت کے

(۲) اگر اس کا مژہ خوں خوار ہے تو میری مژہ بھی خونبار ہے اگر سب اسی کو دیدو ں تو اپنی مژہ کے لئے کیا رکھوں ۔

(۳) یعنی ایسی عمر جاوید کس کام کی کہ چوروں کی طرح چھپتے پھرتے ہو۔

(۴) ادا بلا بھی تو میرے ہی لئے ہوتی ہے سارے جہان کے لئے کیوں ہوئی ۔

(۵) یہ سچ ہے کہ درازدستی کا امتحان بھی ہو سکتا ہے جب نخچیر یا کشتی تیغ زن سے دور ہو لیکن کیا ایک میں ہی امتحان کے لئے رہ گیا ہوں اور بھی تو کشتی ہیں اگر قاتل کی زد سے رکھنا ہے تو دور رکھ ۔

(۶) یعنی میری کوشش بے سود اور قابل رحم بھی ہے۔

(۷) دہ سے پاسباں مراد ہے کہ پہلے وہ سائل کو در معشوق پر آنے سے مزاحم نہ ہوا تھا لیکن ان کی شامت جو آئی تو اس کے پاؤں پر گر پڑے اس سے وہ مطلب سمجھ گیا اور گردن میں ہاتھ دیا اس شعر میں ایسی بندش پائی جاتی ہے کہ جواب نہیں ۔

اگر ان اشعار کی تشریح میں کوئی بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو باقر صاحب کی تشریح بھی ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ نوید یعنی خوش خبری ۔ بیداد دوست مری جاں کے لئے امن اور چین کی خوشخبری ہے کیونکہ دوست نے کوئی طرز ستم آسماں کے لئے باقی نہیں رکھی سبھی قسم کے ظلم اس نے مجھ پر ختم کر دیئے لہذا میری جان جور فلک سے بے خطر ہو گئی ۔

۲۔ اگر مژگانِ یار تشنۂ خوں ہیں تو ہوا کریں آخر میری مژگاں بھی تو خوں فشاں ہیں اس لئے مجھے چاہیئے کہ کچھ خون میں اپنی مژگاں کی خوں فشانی کے لئے رکھ لوں تمام کا تمام خون مژۂ یار کی نظر نہ کردوں اگر میں سب خون اس کے حوالہ کر دوں گا تو میرے پاس اپنی مژگاں کے لئے کیا رہے گا۔

۳۔ خضر عمرِ جاوداں کے مالک ہیں کہتے ہیں کہ جناب خضر آپ کی عمرِ جاوداں کس کام کی۔ نہ کسی سے ملتے جلتے ہو نہ کسی کو دکھائی دیتے ہو۔ بلکہ عمرِ جاوداں کے لئے چور بن گئے ہو بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے زندہ ہم ہیں کہ تمام دُنیا سے روشناس ہیں اور ہر ایک سے کھلم کھلا ملتے ہیں۔

۴۔ میں مصیبت میں مبتلا ہوں لیکن پھر بھی رشک نے مجھے نہیں چھوڑا یعنی مصیبت میں مصیبت یہ ہے کہ میں مبتلائے رشک و آفت ہوں اور یہ رشک اس بات کا ہے کہ تیری ادا بلا ہی سہی لیکن وہ سارے جہان کے لئے بلا کیوں ہے مطلب یہ ہے کہ اگر بلا تھی تو صرف میرے لئے ہونا چاہیئے تھی۔

۵۔ اے فلک یہ درست ہے کہ قاتل کی درازدستی کا امتحان اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ شکار اس سے دور ہو لیکن کیا صرف میں ہی اس امتحان کے لئے رہ گیا ہوں کہ تو نے مجھے قتل سے دور رکھا ہے اے فلک مجھے اس سے دور نہ رکھ قاتل کی درازدستی کا امتحان ہو سکتا ہے۔

۶۔ میری کوشش اور سعی کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اسیر پرندہ قفس میں

آشیانہ بنانے کے لئے تنکے جمع کرتا ہے گویا میری کوشش بے سود بھی ہے اور قابل رحم بھی بقول حالی اس سے زیادہ سختی کسی پیرایہ میں ادا نہیں ہو سکتی۔

۷۔ (حالی) غالب نے اتنے بڑے مضمون کو کہ میں معشوق کے مکان پر پہونچا تو اوّل خاموش کھڑا رہا پھر پاسبان کے قدموں پر گر پڑا اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے اس لئے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے" اس شعر میں ادا کیا ہے۔

(طباطبائی) جو واقعہ میرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضروری تھی ایک تو یہ کہ پاسباں نے سائل کے ساتھ کیا سلوک کیا دوسرے یہ کہ سائل پاسباں سے چاہتا کیا تھا تو یہ دونوں باتیں بصراحت بیان نہیں کی گئیں صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں مگر صراحت زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہے پہلی بات پر لفظ شامت اور دوسری پر قدم لینا صرف (صراحت کرتا ہے) دلالت کرتا ہے اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

اقتباس تاریخ و تنقید

جناب حامد حسین قادری مصنف تاریخ و تنقید نے اپنی کتاب میں

ہم وزن و قافیہ اور ہم ردیف غزلوں میں غالب مومن ذوق کا جو موازنہ کیا ہے ہم اسے بجنسہٖ ان کی کتاب سے نقل کرتے ہیں تاکہ اہلِ نظر و اہلِ دانش تینوں عظیم ہستیوں کے کمالات کے متعلق صحیح اندازہ لگا سکیں۔

ہم بحر و ہم قافیہ اشعار میں مختلف شاعروں کی رسائی فکر و رفعت تخیل تلاش الفاظ اور اسلوب بیان کے مقابلہ کا خوب موقع ملتا ہے نمونہ کے طور پر ہم غالب، مومن اور ذوق کے چند اشعار کا موازنہ کرتے ہیں۔
غالب شاعری کے لئے پیدا ہوئے تھے اور شاعری ان کے لئے ان کے علوِ تخیل کا یہ عالم ہے کہ ولی سے لیکر آج تک یہ بلندی کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ مومن بھی شاعرانہ طبیعت اور عاشقانہ دل لائے تھے ان کی طبیعت میں ایک مزہ تھا یہ سچ ہے کہ لطافت تخیل رفعت فکر اور جدتِ بیان میں غالب کے بعد مومن ہی کا درجہ ہے ذوق صرف مشاق تھے قادر الکلام تھے اُستاد تھے اور بس ان کی پرواز سطح سے صرف چند گز بلند ہے ماوراء السحاب و ما فوق السماء ان کی رسائی سے بلند تر۔ زبان پر ان کے بڑے احسانات ہیں لیکن حقیقت شعری ان کی ممنون نہیں وہ ان دل والوں میں نہ تھے جن کی ہر آہ مرثیۂ دل ہر کراہ دیوان درد ہوتی ہے ان کی طبیعت میں مزہ نہ تھا اسی لئے ان کی شاعری بے مزہ ہے۔
زمین مقابلہ (زبان کے لئے فغاں کے لئے) میں غالب کے چودہ شعر ہیں جن میں ۵ شعر کا قطعہ مدحیہ بھی شامل ہے مومن کے ۱۴، ذوق کے

۲۸ - غالب کا گہرا رنگ یہاں نہیں ہے مومن کی رنگینی بڑی حد تک روشن ہے۔ ذوق اپنی پوری رنگا رنگی کے ساتھ چمک رہے ہیں بہت زور لگایا ہے اس میں شک نہیں کہ خوب خوب شعر نکالے ہیں بس شعر ہی شعر ہیں شاعری کچھ نہیں ذوق نے آسمان کا قافیہ چار جگہ باندھا ہے۔

(ذوق)

نہیں ثبات بلندیِ عزّ و شاں کے لئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کیلئے
ستم ظریف ہوا کون آسماں کے لئے

دمِ عروج ہے کیا فکر نردباں کے لئے
کمندِ آہ تو ہے بامِ آسماں کے لئے

بلند ہووے اگر کوئی میرا شعلۂ آہ
تو ایک اور ہو خورشید آسماں کیلئے

چاروں شعروں میں کوئی بلند اور نیا خیال نہیں "صرف ہزار لطف" والے شعر میں البتہ ایک لطف ہے مومن نے ایک بات پیدا کی ہے۔ فرماتے ہیں :-

نہ پائے یار کے بوسے نہ آستاں کے لئے
عبث میں خاک ہوا میلِ آسماں کے لئے

مومن کے اس مطلع میں ان کے منجم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن غالبؔ کا مطلع تخیل کا عجیب نمونہ ہے ذوقؔ کے پُر لطف شعر کے ساتھ پڑھیئے اور دونوں کو بار بار پڑھ کر موازنہ کا لطف اُٹھائیے کہتے ہیں :۔

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

ان تینوں کی زبان آرائی ملاحظہ ہو ذوقؔ کہتے ہیں :۔

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے
سو دل میں ہم نے مزے سوزشِ جہاں کے لئے

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زبان دل کے لئے ہے نہ دل زباں کیلئے

وہی موجیں ہیں کہ سطح آب سے بلند نہیں ہوتیں۔
مومنؔ کا شعر ہے اور کس قدر بلند و بامزہ ہے۔

مزہ یہ شکوہ میں آیا کہ بے مزہ ہوئے وہ
بنیں تلخ کام رہا لذتِ زباں کے لئے

مضمون کی شگفتگی کے ساتھ مزہ اور بے مزہ کا تفاوت تلخ کام کا انتخاب اور لذت زبان کی ایجاد بھی دیکھئے غالبؔ کے یہاں قافیہ مدحیہ میں ہے لیکن رنگ غزل سے خالی نہیں اور اپنے لطف بیان سے قبول عام و بقائے دوام کا مالک ہے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا | کہ میرے نُطق نے بوسے مری زباں کے لئے

آشیاں کا قافیہ دیکھئے ذوق کے یہاں پھر وہی قافیہ پیمائی ہے۔

صبا جو لائے خس و خار گلستاں کے لئے
قفس میں کیونکہ نہ تڑپے دِل آشیاں کیلئے

مومن کا مضمون دیکھئے۔

کہاں وہ عیش اسیری کہاں رہ اس قفس
ہے بیم برق بلا روز آشیاں کے لئے

غالب نے خوب مثال پیدا کی ہے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

جاوداں کے قافیہ میں ذوق نے بہت زور لگا کر ایک بات پیدا کی ہے۔

اگر اُمید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس
بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے

مومن نے بھی اس قافیہ پر پوری قوت صرف کی ہے لیکن اس کوہِ کندن کا نتیجہ کاہ برآوردن نہیں ہوا بلکہ زورِ ایجاد سے دلچسپ مضمون پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں
اُمید یک شبہ ہے یاس جاوداں کے لئے

غالب نے جو شعر کہا ہے وہ نہایت بے ساختہ ہے خضر کا مضمون

عام ہے لیکن شاعری کی جدت طرازی نے شوخ مقابلہ کر کے خوب شعر بنا دیا ہے "چور بنے" کا ٹکڑا بہت پر لطف ہے سنیئے :-

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

"امتحان" کا قافیہ ذوق کے ہاں دیکھئے ذہن کی رسائی یہیں تک ہے۔

وہ مول لیتے ہیں جبدم کوئی نئی تلوار
لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لئے

مومن کا اسلوبِ بیان قابل دید ہے۔

بھلا ہوا کہ وفا آزما نتم سے ہوئے ہمیں بھی دینی تھی جاں انکے امتحان کیلئے

غالب کا مضمون اور انداز بیان غالب ہی کا حصہ ہے۔

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیِٔ قاتل کے امتحاں کے لئے

"جہاں" کا قافیہ "ذوق" نظم فرماتے ہیں :-

بنایا آدمی کو ذوق اک جزوِ ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے

خالص میاں جی گری ہے۔

مومن کی وارفتگی ملاحظہ ہو۔ خوب کہا ہے۔

جنونِ عشقِ ازل کیوں نہ خاک اڑائیں کہ ہم جہاں میں آئے ہیں ویرانی جہاں کے لئے

غالب کی جو بات ہے نرالی ہے رشک کے عجیب عجیب مضمون لکھے ہیں کہ اکثر شاعروں کا تصور بھی وہاں تک نہ پہونچا ان ہی عجائبات میں سے ایک عجوبہ روزگار یہ بھی ہے ۔

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

تینوں کے ہم قافیہ اشعار بھی تھے ان سے تینوں کی ذہنیت کا اندازہ ہوسکتا ہے اب دو دو کا مقابلہ دیکھئے بعض قافیئے۔ غالب و مومن کے یہاں ہیں۔ ذوق کے ہاں نہیں بعض قافیئے مومن اور ذوق نے لکھے ہیں غالب نے نہیں لکھے "مرگ ناگہاں کا بہانہ ذوق و مومن دونوں نے تلاش کیا ہے ذوق نے صرف سامنے پڑی ہوئی چیز اٹھالی ہے مومن نے اپنے سحر سے اس کو گلدستہ بنا دیا ہے ذوق لکھتے ہیں :۔

اشارہ چشم کا تیری یکایک اے قاتل
ہوا بہانہ مری مرگ ناگہاں کے لئے

مومن کا شعر ہے :۔

دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لئے
سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے

"فغاں" کا قافیہ دیکھئے ذوق :۔

شالِ نَے ہے مرا جب تلک کہ دم میں دم
فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کے لئے

"دم میں دم" کو ایک مرتبہ پھر پڑھ کر دیکھ لیجئے دم تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔
مومن کہتے ہیں :۔

حجاب چرخ بلا سے ہوا کرے بیتاب
فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے

غالب و مومن کے یہاں ایک قافیہ پاسباں کا مشترک ہے مومن کے نشتر
بنے جائیں تو یہ ایک تیز نشتر یہ ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی فرماتے ہیں۔

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لئے

غالب نے بھی جو مضمون نکالا ہے اور جس انداز سے لکھا ہے اس کے
رے دل ہی لیتا ہے زبان قلم قاصر ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

(جناب حامد حسین قادری کی تنقید ختم ہوئی)

حضرت جوش ملسیانی نے صفحہ ۳۷ و ۳۸ پر تحریر فرمایا ہے۔

- اہل سخن اور تبصرہ نگار اس فنی نکتہ سے بخوبی واقف ہیں کہ غزل گوئی کا
موازنہ کرنے کے لئے ہم طرح غزلیات کی ضرورت ہوتی ہے مگر افسوس ہے
کہ سوائے ایک غزل کے ایک ہی زمین کی غزلیات دونوں کے دیوان
میں موجود نہیں۔ وہ زمین جس میں دونوں کی غزلیات اہل نظر کے
سامنے آئیں یہ ہے۔

بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

جوش صاحب نے یا تو دیوان ذوق ملاحظہ و مطالعہ فرمانے کی کوشش نہیں کی یا دیدہ و دانستہ غالب کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے حقیقت سے چشم پوشی کی ہے ورنہ دیوان ذوق میں کئی ایسی غزلیں ہیں جو غالب کی غزلوں کی ہموزن۔ یا ہم قافیہ یا ہم ردیف ہیں۔

ہموزن۔ ہم قافیہ اور ہم ردیف غزل ۱

ذوق

یہاں تک لاغری ہے اس نزے بیمار کے تن کو
عجب کیا ہے جو سمجھے طوق گردن چشم سوزن کو

زیادہ ہوتا ہے پیری میں غرور نفس امارہ
یہ بالوں کی سفیدی شیر ہے اس مار رہزن کو

کمند نام و شہرت کھینچ لاتی ہے عدم سے بھی
پلٹ کر مثل طوق فاختہ عنقا کی گردن کو

غالب

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگان سوزن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جنبش جوہر نے آہن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگہ کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

ہموزن۔ ہم قافیہ اور ہم ردیف غزل ۲

ذوق

خط بڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں
کیا جانیں لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

بے بادہ عمرگی میں ہوا ذوق جو بسر
کی توبہ بے وقوف نے ناحق شباب میں

غالب

میں اور حظِّ وصل خداداد بات ہے
جاں دینی نذر بھول گیا اضطراب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

تیوری چڑھی ہوئی ہے اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں نگاہ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

ذوق	غالب
	ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

ہموزن ۔ ہم قافیہ ۔ ہم ردیف غزل ۳

ذوق	غالب
کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے کھلے ہے ناز سے گلشن میں غنچۂ نرگس ذرا دکھا تو اسے چشمِ نیم خواب تو دے گزر لے گو کہ مرے سر سے اتنا آب تو دے کہ سر پہ چرخ بھی دکھلائی جوں حباب تو دے جواب نامہ نہیں گر تو رکھ دو نامۂ یار جو پوچھیں قبر میں عاشق سے کچھ جواب تو دے خنک دلوں کی اگر مشتِ خاک دوزخ میں پڑے تو واں بھی اک بار آگ داب تو دے	پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہا جو اس نے میرے ہاتھ پاؤں داب تو دے

ذوق	غالب
ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں وہ پہلے بزم میں دیکھیں کدھر کو دیکھتے ہیں	یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

ذوقؔ

گہر کو جوہری صراف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کو دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں
وہ روز ہم کو گزرتا ہے جیسے عید کا دن
کبھی جو شکل تمہاری سحر کو دیکھتے ہیں
بنا کے آئینہ دیکھے ہے پہلے آئینہ گر
ہنرور اپنے بھی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

غالبؔ

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اس کے طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

ان دونوں اہل کمال کے اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ:۔
غالبؔ کے اشعار میں معنی آفرینی۔ نزاکت خیال۔ تصوف۔ شوخی۔ غم۔ اخلاق۔ بلندی خیال سب کچھ موجود ہے لیکن ذوقؔ کے اشعار میں یہ خوبیاں بہت کم ہیں نہ تو وہ زور بیان ہے نہ وہ سلاست ہے اور نہ وہ وجدانی کیفیت ہے جو غالبؔ کے یہاں موجود ہے غالبؔ کے اشعار ذوقؔ کے اشعار سے بہت بلند وارفع ہیں ان کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ان اشعار کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ خواص تو خواص عوام بھی مجلسوں میں پڑھ کر ان اشعار کے مزے لیتے ہیں اور ذوقؔ کے اشعار میں سے کسی ایک کو بھی خاص موقعوں پر پڑھتے ہوئے نہیں سنا گیا۔ اسی طرح غالبؔ کی دوسری غزلوں کا ذوقؔ کی غزلوں سے مقابلہ کیا جائے تو غالبؔ کی غزلوں کا پایہ بہت بلند ہے۔ ذوقؔ۔ غالبؔ کے خیالات کی رفعتوں نہیں پہنچ سکتے اور ذوقؔ ہی پر کیا منحصر ہے ان کے پہلے جتنے شاعر بھی ہوئے علوِ تخیل میں غالبؔ سب سے اونچے نظر آتے ہیں۔

حضرت جوش نے مرزا کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے اپنی شرح کے صفحہ ۴۹ پر لکھا ہے۔

غالب کی وفات سے تیس سال بعد یعنی بیسویں صدی کے شروع میں ان کے کلام کی مقبولیت اور شہرت بہت زیادہ ہونے لگی۔ اس کی بڑی وجہ ان کی فلسفیانہ شاعری تھی فلسفۂ عشق و محبت کے مضامین اگرچہ مرزا سے پہلے بھی شعرا کے کلام میں کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں مگر اس قدر جس قدر آٹے میں نمک۔ یہ مضامین مرزا ہی کی شاعری کا خاص میدان کہے جاتے ہیں مرزا کے دیوان کا پہلا مطلع بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے چونکہ اعلیٰ تعلیم زیادہ پھیل جانے سے تعلیم یافتہ لوگ فلسفیانہ خیالات کے دلدادہ ہو رہے تھے اور اس قسم کی شاعری کسی اور کے کلام میں نظر نہیں آتی تھی اس لئے کلام غالب کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ بہت سے شعراء نے بھی اسی رنگ میں کہنا شروع کردیا اور ان کی اس کوشش کو بھی قابل قدر سمجھا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قسم کی شاعری تمام دُنیائے اُردو پر چھا گئی اور قدیم طرز کی شاعری نظروں سے گرتی گئی یہ اثر دہلی اسکول تک ہی محدود نہ رہا بلکہ لکھنؤ اسکول بھی اس سے اثر پذیر ہوا نیز ہر قسم کی پیروی کرنے والوں میں حالی، اقبال، اکبر، یگانہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

صفحہ ۵۶ پر لکھتے ہیں۔

"مرزا غالب شاعری کو قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی سمجھتے تھے سطحی شاعری سے انہیں نفرت تھی اس لئے نئے نئے مضمون۔ نئے نئے خیال، نئے اسلوب، بندش، نئے نئے انداز بیان ان کے کلام میں جا بجا پائے جاتے ہیں۔"
مرزا کی شوخی طبع رنج و غم کے مضامین میں بھی شوخ بیانی سے نہ رکتی تھی۔"

مذکورہ بالا سطور پڑھنے کے بعد ناظرین خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ذوق اور غالب کا موازنہ کرتے وقت کتنی بے انصافی سے کام لیا ہے۔

مولانا طباطبائی کی شرح دیوان غالب

مولانا طباطبائی نے جو دیوان غالب کی شرح لکھی ہے اس میں کئی نقائص ہیں۔

(۱) اکثر اشعار کا مطلب اور تشریح نہ پوری طرح نہیں کرتے بلکہ اتنا مختصر لکھتے ہیں کہ اس عبارت کی تشریح کی پھر ضرورت پڑتی ہے۔

(۲) اکثر اشعار کا مطلب وہ دوسرے شارحین سے مختلف بیان کرتے ہیں اور اس شعر کے بالکل اُلٹے معنی لکھتے ہیں حالانکہ دوسرے شارحین اس شعر کے مطلب میں متفق البیان ہوتے ہیں۔

(۳) غالب کے اشعار میں اصلاح فرماتے ہیں علم عروض اور قواعد صرف نحو کی غلطیاں نکالتے ہیں اور غیر متعلق باتیں بہت لکھتے ہیں۔

(۴) غالبؔ کے بعض اشعار کو بالکل بے معنی اور مُہمل سمجھتے ہیں۔
ان چاروں باتوں کے متعلق ہم ان کی شرح دیوان غالبؔ سے مثالیں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ غالبؔ کی مشہور غزل کے چند اشعار کی تشریح ملاحظہ فرمائیے جو ہم بلا کم و کاست نقل کرتے ہیں۔

(۱) کوئی اُمید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی

تشریح :۔ یعنی حصول اُمید کی صورت۔

(۲) آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی

تشریح :۔ یہ وہ شعر ہے کہ مہر کو بھی جس پر رشک کرنا چاہئے۔ افسردگیٔ خاطر کو کس عنوان سے بیان کیا ہے۔

(۳) جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد   پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

تشریح :۔ طاعت و زہد کا محض جان لینا کافی نہیں جب تک کہ توفیق شامل نہ ہو سکے ۔ (؟) پھر اُدھر سے۔

(۴) داغِ دل گر نظر نہیں آتا   بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

تشریح :۔ دوسرے مصرع میں اِستفہام اِنکاری ہے اور چارہ گر کی نافہمی پر تشنیع ہے۔

(۵) مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی   موت آتی ہے پر نہیں آتی

تشریح :۔ پہلا مرنا مجاز ہے کثرت شوق کے معنی پر اور دوسرا مرنا معنی حقیقی پر ہے۔

دوسری غزل

(۶)

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا　　کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

یعنی آپ شرمندگی سے منہ نہیں دکھلاتے یہ بھی میرے لئے ستم ہے۔

(۷)

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

تشریح :۔ توکل کی طرف اشارہ ہے۔

(۸)

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

تشریح :۔ یعنی وہ عداوت کرتا تو ہم لگاوٹ سمجھتے۔

(۹)

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ　　یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

تشریح :۔ یارب اس شعر میں ندا کے لئے نہیں اظہار تعجب کے لئے ہے۔

(۱۰)

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے　　آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

تشریح :۔ کیا دوسرے مصرع میں تحقیر کے لئے۔

اسی طرح آپ کو طبا طبائی کی شرح میں اکثر اشعار کی شرح اتنی ہی مختصر ملے گی ۔

(۲) اکثر اشعار کا مطلب وہ دوسرے شارحین سے مختلف لکھتے ہیں حالانکہ شارحین ان کے مطلب میں متفق ہوتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

(۱)

دل میں ذوقِ وصل یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

(سہا) عشق کے اس مقام کی طرف اشارہ ہے جب اُمید و یاس، وصل و ہجر، یادِ محبوب غرضیکہ کسی جذبہ کا احساس باقی نہیں رہتا اور یہ وہ مقام حیرت و عالم فراموشی ہے کہ اس کے بعد انا المحبوب اور انا الحق کی کیفیت طاری ہوتی ہے ۔

باقر ۔ عشق کے آغاز میں میرے خانۂ دل میں ہر وقت یار کی یاد اور شوقِ وصل کے خیالات موجزن رہتے تھے لیکن عشق کی آگ نے بھڑک کر خانۂ دل اس طرح پھونک ڈالا کہ اب نہ تو ذوقِ وصل باقی ہے اور نہ یادِ دوست انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ انتہا درجہ مایوس اور نا اُمید ہو جاتا ہے تو کوئی اُمید باقی نہیں رہتی ۔

طبا طبائی ۔ یعنی رشک کی آگ ایسی تھی کہ معشوق کو دل سے بھلا دیا ۔ اور اس کا غیر سے ملنا دیکھ کر ذوقِ وصل جاتا رہا ۔ گھر سے دل ۔ آگ سے رشکِ رقیب مراد ہے ۔

(۲)

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

(باقر) خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تیری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے سے کتنے عشاق کا لہو پانی ہوکر آنکھوں کے راستے بہہ گیا ہوگا یعنی انھیں کس قدر تکلیف پہونچی ہوگی۔ تیری آنکھوں میں آنسو آجانا تیرے چاہنے والوں کے لئے قیامت سے کم نہیں۔

(سعید) تیرے غم میں معلوم نہیں کتنے حرماں نصیبوں کا خون جگر آنسو بن کر آنکھ کے راستے نکلا ہوگا تب کہیں تیری آنکھیں سرشک آلود ہوئی ہیں۔

(بیخود) کس کس عاشق کا لہو پانی کی طرح تو نے بہایا ہوگا۔ اب ان بے گناہوں کی یاد تجھ کو رلا رہی ہے۔

(طباطبائی) مژگانِ معشوق جو ہمیشہ عشاق کے دل و جگر میں کھٹکا کرتے ہیں اس کا آنسو وہی آنسو ہے جو عشاق کے دل میں پیدا ہوکر آنکھوں کی طرف جانا چاہتے ہیں اور تیری مژہ پر آنسو ہونا اس کی علامت ہے کہ عشاق کا لہو پانی ایک ہوگیا۔

(حسرت) تیری جفا سے کس کا لہو پانی ہوا ہوگا جس کی ندامت کے باعث تیری آنکھیں سرشک آلود ہیں۔

اسی طرح مثال میں بہت سے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جو

طوالت کے خوف سے نظر انداز کیے جاتے ہیں۔

(۳) شعر کی تشریح میں غیر متعلق باتیں بہت لکھتے ہیں۔ مثلاً :۔

(۱)

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

طباطبائی صاحب نے اس شعر کی کوئی تشریح نہیں کی نہ مطالب لکھا بلکہ سارا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ غالب اور میر کو غیر دہلوی ثابت کیا جائے ان کے چند ایسے الفاظ مثال کے طور پر پیش کیے ہیں۔ جو دلی میں نہیں بولے جاتے۔ اس کے بعد میر اور سودا کا موازنہ کیا ہے جس کی قطعاً ضرورت نہیں تھی اس طرح اِدھر اُدھر کی باتوں میں تقریباً ۲ صفحہ بھر دیے ہیں پھر شعر کی تشریح اسی طرح تشنہ رہی۔

(۲)

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

اس شعر کی تشریح یا مطلب کے بجائے طباطبائی صاحب نے ۱½ صفحہ صرف گرامر و صرف و نحو پر صرف کیا ہے مثال کے طور پر ہم اس ۱½ صفحہ میں چند لائنیں بطور نمونہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

اور نحو اُردو کے حقائق میں سے ایک یہ مسئلہ ہے کہ (تم کو) یہاں ترکیب میں کیا ہے اور (یاد) کیا ہے اور اگر کہیں کہ (دیکھیں) فعل ناقص ہے اسم اس کا بے مہری یارانِ وطن ہے اور خبر اس کی یاد

ہے تو اس صورت میں (تم کو) مفعول نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ فعل ناقص لازم ہوا کرتا ہے ؛ ؛ ر اگر یوں کہیں کہ (نہیں اس مقام میں تامہ ہے اور بے مہری یاراں وطن فاعل اور (تمکو) مفعول ہے تو اس صورت میں (یاد) ترکیب میں کیا ہے اور نہیں تامہ ہوا تو متعدی کیوں ہو گیا؟ ؛ رید دونو اشکال اس طرح رفع ہو سکتے ہیں کہ یوں کہیں کہ پہلی صورت میں (تم کو) ہم مفعول یہ نہیں کہہ سکتے بلکہ متعلق فعل ہے۔ اس لئے (کو) مفعول بہ کے لئے خاص نہیں ہے مفعول لہٗ کے لئے بھی ہوتا ہے جیسے کہتے ہیں حج کو گئے اور مفعول فیہ کے لئے بھی آتا ہے جیسے کہتے ہیں منگل کو روانہ ہوئے طرف کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے پوچھتے ہیں قافلہ کدھر گیا۔

بس اسی قسم کی باتوں میں ، ۲ صفحہ لکھ دیا ہے۔

(۳)

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

اس شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کعبہ میں پیدا ہوئے تھے حضرت غالب فرماتے ہیں کہ خانۂ کعبہ کے سیاہ اور خوشبو دار غلاف کو حضرت علی کے قدم کی وجہ سے مشکیں سمجھنا چاہیئے۔ ورنہ کعبہ کے متعلق یہ تو مشہور ہے کہ وہ ناف زمین (زمین کا وسط) ہے یہ مشہور نہیں ہے کہ وہ نافِ غزال بھی ہے۔

طباطبائی صاحب فرماتے ہیں :-
جان، اس شعر میں بدان کا ترجمہ ہے یا اعلم کا زمین ترکیب اضافی ہے فارسی میں ہے اور اعلان نون کے ساتھ ہی حالانکہ نحو فارسی کے یہ خلاف ہے اس لیے کہ جب زمین میں اعلان نون کیا تو وہ ہندی لفظ ہو گیا پھر اس کی طرف اضافت فارسی کیونکر صحیح ہو گی جیسے سودا کا یہ مصرع :-

تن پر اگر زباں ہو بجائے ہر ایک مور

کہ اس میں ترکیب فارسی میں ایک لفظ آ گیا ہے اور ایک مہند ہے یک کا کعبہ کو ناف زمین کہنا حدیث کا مضمون ہے اور ناف زمین سے وسط زمین مراد ہے لیکن اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ وسط زمین کب سے خط استوا سے اکیس درجہ اور کئی دقیقہ شمال میں ہٹا ہوا ہے اس کا جواب یہ ممکن ہے کہ اول تو ایسی حدیثیں بہت کم ہیں جن کا قطعی صدر الصدور ہونا اور محفوظ المتیقن ہونا ثابت ہو اور مان لینے کے بعد دیکھو اہل یورپ نے خاک چھان کر جو تاریخی حالات تحقیق کیے ہیں ان میں سے یہ امر بھی حیرت خیز ہے کہ اقصائے شمال میں جہاں برف اور سردی انتہا کی ہے بہ کثرت ایسے جانوروں کی ہڈیاں ملتی ہیں جو گرم ملکوں کے رہنے والے ہیں اور کبھی منطقہ حارہ سے باہر رہ کر زندہ نہیں رہ سکتے یہ امر بڑا قرینہ ہے اس بات کا کہ کسی زمانے میں یہ ملک منطقہ حارہ کے نیچے تھے اور جہاں برف پڑا کرتی ہے یہاں لو چلا کرتی ہے۔ اس سے یہ امر بخوبی نکلا۔ کہ جب انفصلائے

شمال منطقہ حارہ میں تھا تو عرب کا ملک ضرور خط استوا پر ہوگا۔

(۴)

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال   تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

یعنی چاہتا ہوں کہ اپنے خیال میں ایسا غرق ہوں کہ پھر آ نہ پھر سکوں۔
اب کروں ہوں۔ پر جو بحث کی ہے اور اس کو غیر فصیح ثابت کیا ہے
اس میں ۲ ½ صفحے بالکل غیر متعلق باتوں سے بھر دیئے ہیں ذرا پڑھ کر لطف
اُٹھایئے۔

(۵)

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں   ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

کسی امر کی سزا میں ہاتھ قلم ہونا یہ مضمون دوسرے مصرع کا ہے پہلے
مصرع میں شاعر کے ذمہ یہ بات ہے کہ اسے بیان کرے جس کے سبب ہاتھ
قلم ہوئے ایسی باتیں بہت سی ہوسکتی ہیں جس کے سبب سے ہاتھ قلم ہوں

"مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر"

اس شعر کی شرح اسی ردیف میں دیکھو۔

اس کے بعد گرامر اور علم عروض کی غیر دلچسپ بحث چھیڑی ہے اور
غیر متعلق باتوں پر ساڑھے پانچ صفحے صرف کیئے ہیں اور بتایا ہے کہ :۔
غالب کے پہلے مصرع سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس وجہ سے ہاتھ
قلم ہوئے۔

خود اسی مصرع پر ۱۷ اگر ہیں لگا کر ظاہر کیا ہے کہ یہ اس طرح بھی

ہو سکتا تھا۔ پھر اسی ضمن میں۔

"اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھچوائی نہیں"

پر ایکیس گرہیں لگائی ہیں اور اپنی شاعری کے کمال کو ظاہر کیا ہے حالانکہ ان سب باتوں کی اس شعر کی تشریح کے سلسلہ میں قطعاً ضرورت نہ تھی آپ بھی ان صفحات کو پڑھ کر لطف اٹھایئے۔

حضرت غالب کے کلام میں اصلاح فرماتے ہیں۔

پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

تشریح:۔ پیچ آپڑنے سے یہاں مراد بات کا نباہنا جس کے خلاف میں شماتت کا اندیشہ ہو کہتے ہیں اس نے آنے کا وعدہ کیا تو مجھے انتظار کرنا ضرور ہے گو وہ وعدہ خلاف ہے لیکن میں انتظار نہ کروں تو میرے وعدے کو جھوٹا سمجھا۔ مگر کے معنی پر (پہ) سے فصیح ہے اور یاں سے یہاں بہتر ہے یعنی دوسرا مصرع یوں ہوتا۔ ع

"وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے"

تو اس میں (پہ) یاں کے نکل جانے سے بندش اچھی ہو جاتی۔ اور پہ کا حذف کرنا محاورہ میں بہت ہے کچھ معانی میں خلل بھی نہ آتا۔ مگر سچ پوچھو تو ایسی ذرا ذرا سی باتوں کا کوئی بھی خیال نہیں رکھتا عود ہندی میں پیچ کا لفظ مصنف کی زبان پر تذکیر ہے مگر اس شعر میں تانیث ہے غالباً یہ سبب ہوا پہلے یہ دیوان لکھنؤ میں تھا وہاں کاتب نے تصرف کر دیا اور پھر مصنف

ے بھی یوں ہی رہنے دیا۔ سہرے میں بھی اکثر جگہ اصلاح فرمانے کی کوشش
ہے حضرت غالب کے اکثر اشعار کو مہمل قرار دیتے ہیں۔

(۳) صفحہ ۲۶۸ -

آمدِ سیلاب طوفانِ صدائے آب ہے
نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ ہے

باقر: نقش پا کو صورت کان سے اور جادہ کو (پگڈنڈی) انگلی
سے مشابہت ہے۔

طوفان آب کی آواز آرہی ہے اسے سن کر نقش پا نے اپنے کان
میں جادہ (پگڈنڈی) کی انگلی رکھ لی ہے تاکہ طوفان آب سے وہ خوفزدہ
نہ ہو خوف پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ طوفان آئے گا تو نقش مٹ
جائے گا۔

لیکن طباطبائی صاحب فرماتے ہیں۔ سچ پوچھو تو یہ شعر بے معنی ہے
اور اس سبب سے شرح سے مستغنی ہے پھر تقریباً ½ ۱ صفحہ میں اس کی عروضی
غلطیوں پر بحث کی ہے۔

(۱)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مرزا غالب نے اس شعر کی شرح خود ایک خط میں فرمائی ہے۔

"ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ (فریادی) کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم

کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلا ناخون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر
لے جانا بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی
ہے جو صورت تحریر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی اگرچہ مثل تصاویر
اعتبار محض ہو موجب رنج و ملال ہے۔ (عود ہندی)

سعید، آسی، سہا، بیخود، یہ سب اس شعر کو بامعنی قرار دیتے ہیں
لیکن طباطبائی اس شعر کو بے معنی کہتے ہیں۔

(۲)

ہیں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اے غافل میں عدم کے مقام سے آگے
نکل گیا ہوں ورنہ جب میرا مقام عدم تھا تو جب کبھی وہاں میں نے آہِ
آتشیں کھینچی اس کی آگ سے عنقا کے پر جل گئے شعر میں خوبی یہ ہے کہ
عنقا ایک معدوم پرندہ ہے گویا وہ مقام عدم رکھتا ہے شاعر کہتا ہے
کہ جب میں اس مقام میں تھا تو میری آہِ آتشیں سے عنقا کے پر جل جاتے تھے
یعنی فنا فی العدم ہونے پر بھی میری آہ میں اس قدر گرمی تھی۔ بقول حسرت
اپنی ہستی کے بیان میں مبالغہ کیا ہے۔

باقر، سہا، حسرت، اور بے خود تو اسے بامعنی سمجھتے ہیں لیکن
طباطبائی اسے بے معانی سمجھتے ہیں۔

انتخاب کلام مومن پر تنقید

نگم کتاب گھر نے انتخاب کلام مومن شائع کیا ہے جس کو عبدالودود خاں صاحب نے مرتب کیا ہے اگر وہ مومن کی تعریف میں قصیدہ خوانی کرتے تو ہمیں بالکل اعتراض نہ تھا اس لئے کہ مومن ایک بڑے اعلیٰ درجہ کے حکیم، ایک حق شناس آدمی بہت بڑے منجم اور اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے ان کی خوبیوں کا زمانہ معترف ہے اور ہم بھی اپنا سر عقیدت ان کے سامنے خم کرتے ہیں لیکن عبدالودود صاحب نے بعض واقعات لکھ کر ان کی تعریف نہیں کی بلکہ ان کی توہین کی ہے اور ان کے کیرکٹر کو ان کے عقیدتمندوں کی نظروں میں گرادیا ہے۔

ایک طرف تو وہ لکھتے ہیں :۔

مومن سوائے خدا کے کسی پر بھروسہ نہیں کرتے تھے اپنی مصیبت کا حال خدا سے بیان کرکے اس سے امداد کے طالب ہوتے تھے یہی مومن کی خدا پرستی اور مذہب پرستی تھی کہ جس نے ان کو در بدر کاسہ لیس ہونے سے بچایا نہ صرف کاسہ لیس ہونے سے بچایا بلکہ انہیں حضرت سید احمد شہید رح بریلوی رح کا معتقد اور مرید کردیا پھر بھلا ایسی بارگاہ کا معتقد اور مرید کسی صاحبِ ثروت کے آگے کس طرح سر جھکاتا مومن کو یہ شرف صرف حضرت سید احمد شہید سے ہی نہیں ملا بلکہ مومن کی مجلسی زندگی کا زیادہ حصہ جو اپنے گھر

کے مذہبی ماحول میں بسر ہوا اس نے ان پر اثر ڈالا اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مجالس اور تعلیم نے اس کو پختہ کر دیا صرف یہی نہیں بلکہ مومن نے جگہ جگہ غزلیات میں بھی مذہب کو شامل کیا ہے اور ہمیشہ جہاد کے متمنی رہے گو کہ ان کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی ۔

گویا مومن کو عبدالودود صاحب نے ایک مجتہد، زبردست مذہبی آدمی، مجاہد، خدا پر بھروسہ رکھنے والا اور بڑے بڑے بزرگوں کی صحبت سے فیض حاصل کرنے والا لکھا ہے بلکہ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی کا مرید اور معتقد ثابت کیا ہے ۔

دوسری جگہ انھوں نے ایک خانگی عورت مساۃ امتہ الفاطمہ بیگم سے عشقبازی کے حالات بھی لکھے ہیں ۔

ایک عورت مساۃ امتہ الفاطمہ بیگم جس کو صاحب بھی کہتے ہیں درمیان شاہ جہاں آباد کے مومن خاں سے ملاقات اس کی بتقریب علاج کے ہوئی تھی مدت تک آشنائی رہی کئی سال گذرے کہ لکھنؤ چلی گئی ۔ وہ ایک خانگی تھی مثنوی قول غمین مومن کی اسی محبوبہ کے عشق میں ہے باسبب فیض صحبت مومن خاں وہ بھی شعر کہنے لگی تھی ۔ لیکن اگر مومن نے عشق کیا تو کیا غضب کیا ۔ دور ظفر کے اس بغداد میں عشق و عاشقی لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے اور مومن نے اسی شہر اور اس کے ماحول میں پرورش پائی تھی پھر وہ اس سے کس طرح الگ رہتے

اُن کے کلام میں اس عشق کا رنگ ملتا ہے

دِلّی سے رام پور میں لایا جنونِ عشق

ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

یہ تو حکیم مومن خاں کی تعریف نہ ہوئی۔ یہ تو ان کی کھلی ہوئی توہین ہے ایسا مذہبی اور متقی انسان گرا تو ایسا گرا کہ ایک خانگی عشق میں مارا مارا پھر رہا ہے یا تو یہ خانگی کا واقعہ غلط ہے اگر واقعہ صحیح ہے تو وہ کوئی اور مومن ہوں گے۔ جو عارف باللہ بہت بڑے مذہبی اور خدا پرست انسان تھے بھلا ایک مذہبی آدمی کو ان باتوں سے کیا واسطہ۔

اسی طرح عبدالودود صاحب نے غالبؔ کو کاسہ لیس۔ شرابی۔ اُمراء کی شان میں قصیدہ گو شاہ ظفر کا مدح سرا۔ انگریز حکام کا چاپلوس اور غیر خود دار وغیرہ کہکر غالبؔ کے کیریکٹر پر حملے کئے ہیں۔

یہ ایک نہایت بیہودہ اور لغو بات ہے کہ ایک مرے ہوئے شخص کے کیریکٹر پر اس قسم کے حملے کئے جائیں پھر تو زمانہ ماضی و حال کے کسی شاعر یا بڑے آدمی کی عزت و عصمت محفوظ نہیں رہ سکتی یہ لوگ اپنی کتاب فروخت کرنے کے لئے ایسی لغو اور بیہودہ باتیں لکھ کر گرم بازاری کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ وہ اُردو ادب کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں

پبلشر صاحبان کا اولین فرض ہے کہ وہ اس قسم کی کتاب چھاپنے سے گریز کریں۔ یا اس قسم کی لغو باتوں کو نظر ثانی کر کے نکال دیا کریں۔

سہرا

غالب اور ذوق کا موازنہ

اردو زبان میں غالب سے پہلے کسی نے سہرا نہیں لکھا۔ وہی سہرے کے موجد ہیں۔ سہرے کی ایجاد کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ولی سے لیکر غالب کے زمانہ تک کسی شاعر کے کلام میں سہرا نظر نہیں آتا۔ ذوق اور دوسرے شاعروں نے جو سہرے لکھے ہیں وہ غالب کی تقلید میں لکھے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان شعراء کا کوئی شعر اچھا ہو لیکن اولیت کا شرف ہمیشہ غالب ہی کو رہے گا۔

غالب نے کئی سہرے لکھے ہیں جو ان کے شاگردوں کی بیاض میں موجود ہیں۔ ان میں سے دو سہرے اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں۔

سہرا

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں

بزمِ شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا

ان کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں و لے بحر رواں ہے سہرا
(از بیاض نواب علاء الدین احمد خاں علائی)
قلمی

سہرا

چرخ تک دھوم ہے کس دھوم سے آیا سہرا
چاند کا دائرہ لے زہرا نے گایا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں آپس میں الجھ کر لڑیاں
باندھنے کے لئے...... اٹھایا سہرا
(لال قلعہ کی جھلک ناصر نذر فراق صفحہ ۳)

لیکن غالب کا سب سے زیادہ مشہور سہرا وہی ہے جو انھوں نے مرزا جواں بخت کی شادی کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

اس سہرے کی وجہ تصنیف یہ ہے کہ نواب زینت محل بادشاہ بیگم کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا مرزا جواں بخت ان کے بیٹے تھے جب مرزا جواں بخت کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم دھام سے یہ شادی رچائی گئی نواب زینت محل کے ایما سے غالب نے مرزا جواں بخت کے لئے سہرا لکھا اور ایک زرنگار کاغذ پر لکھوا کر اور ایک سنہری کشتی میں لگا کر بڑے تکلف کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ سہرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے لیکن مقطع پر نظر

پڑی تو وہ یہ سمجھے کہ ہمارے اُستاد ذوق پر چوٹ کی گئی ہے جب ذوق حسبِ معمول ان کے پاس آئے تو بادشاہ نے وہ سہرا ان کو دکھایا اور کہا ذرا مقطع بھی دیکھئے اور اس سہرے کا جواب لکھئے۔ ذوق اسی وقت لکھنے بیٹھ گئے اور غالب کے سہرے کے جواب میں سہرا لکھا اور بادشاہ کو دکھایا۔

اربابِ نشاط کو بلا کر وہ سہرا یاد کرایا گیا انھوں نے وہ سہرا محفلوں میں گا کر سنایا مرزا کو جب اس واقعہ کی خبر لگی تو انھیں بڑا رنج ہوا۔ انھوں نے سوچا کیا تھا اور ہو گیا کچھ آخر کار ایک معذرت لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں گزرانی کہ طبیعت پر جو ملال آ گیا ہے وہ رفع ہو جائے بادشاہ کا دل اس معذرت سے صاف ہو گیا ذیل میں غالب اور ذوق کے سہرے درج کرتے ہیں۔ طبا طبائی اور طیبانی صاحب نے ان اشعار کی تشریح کر کے جو ذوق کے کلام کو سراہا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ کیا ان بزرگوں نے موازنہ یا تنقید کرتے وقت انصاف سے کام لیا ہے؟

غالب کا سہرا

(۱) خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

(۲) کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

ذوق کا سہرا

(۱) اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

(۲) وہ کہے صلِ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

(۳) ایک کو ایک پہ تزئین ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

غالب

(۳) سر پہ چڑھنا ہے تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

(۴) ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

(۵) سات دریا کے فراہم کیے ہونگے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

(۶) رُخ پہ دُولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

(۷) یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

(۸) جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

(۹) جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

(۱۰) رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

ذوق

(۴) تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
باندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

(۵) آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

(۶) اک گہر بھی نہیں صدکانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

(۷) روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

(۸) تابشِ حُسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُرنور پہ ہے تیرے منور سہرا

(۹) پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

(۱۰) دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیونکر سہرا

(۱۱) رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے مُنہ کو جو تو مُنہ سے اُٹھا کر سہرا

(۱۲) وہ کہے صلِ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

ذوق کا سہرا	غالب کا سہرا
کثرت تار نظر سے ہے تماشائیوں کے	(١١) تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار (١٣)
دم نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا	لائے گا تاب گرانباری گوہر سہرا
(١٤) در خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا	(١٢) ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
واسطے تیرے ترا ذوق ثناگر سہرا	دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا
جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دے اس کو	
(١٥) دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا	

طباطبائی اور جوش ملسیانی صاحب نے ذوق کے مقابلہ میں غالب کے سہرے کی خوبیاں اور نقائص جو بیان کئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(١) مصنف نے پہلے مصرع میں جو محاورہ باندھا ہے "ترے سر سہرا" ذوق نے بھی اپنے مطلع میں باندھا ہے مصنف سے یہ محاورہ پورا نہ بندھا اور ذوق سے پورا اترا محاورہ یہ ہے کہ تیرے سر شاعری کا سہرا ہے تیرے سر فضیلت کا سہرا ہے تیرے سر سعادت کا سہرا ہے خالی سہرا کوئی نہیں کہتا جس طرح مصنف نے بخت کے سر سہرا ہے کہا ہے جس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ سچ مچ کا سہرا مراد ہے ذوق نے پہلے مصرع میں اصلی سہرا مراد لیا ہے اور دوسرے مصرع میں یمن و سعادت کا سہرا شہزادہ کے سر باندھا ہے۔

اس کے بعد حضرت طباطبائی نے دوسرے مصرع کی بحث چھیڑ دی اور اس پر تقریباً ایک صفحہ لکھا ہے جو بالکل غیر ضروری ہے۔

(جوش ملسیانی) ترے سر سہرا ہے یعنی یہ عزت تجھے حاصل ہوئی ہے

شہزادے کے نام کے لحاظ سے بخت کو سہرا باندھنے کے لئے منتخب کرنا حسن بیان کی خوبی ہے ۔

(۲) (طباطبائی) قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق مرحوم نے اس شعر کی چوٹ پر کئی شعر کہے ہیں گھڑے کو انھوں نے بھی باندھا ہے ۔

وہ کہے غسل علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

سہرے کا بھلا لگنا انھوں نے اس طرح کہا :۔

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے پر بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو منہ پر سہرا

پھر اس پر بھی ترقی کی ہے :۔

ایک کو ایک پر تزئین دم آرائش ہے سر پر دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اس میں شک نہیں کہ غالب نے بے مثل شعر کہا تھا مگر ذوق نے جواب دیا اور خوب دیا شعر کا جواب تو ہو گیا اس میں شک نہیں کہ غالب نے بے مثل شعر کہا زیور کا قافیہ غالب ہی کے حصہ میں آیا ذوق نے استادی کی کہ اس قافیہ پر ہاتھ نہیں ڈالا ۔

اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ صفحہ میں گرام کی تکلیف دہ بحث چھیڑ دی ہے جو قطعاً غیر ضروری ہے اور جس کا نفسِ مضمون سے کوئی تعلق نہیں ۔

(جوش ملسیانی) گھڑا پیار کے لئے بولتے ہیں مگر یہ لفظ اکیلا بغیر محاورہ آئے تو فصیح نہیں ہے مرزا نے چاند سے گھڑے کہہ کر محاورۂ زبان ہاتھ

سے نہیں چھوڑا۔

(باقر) تیرے اس چاند سے مکھڑے پر سہرا بہت ہی بھلا معلوم دیتا ہے گویا سہرا تیرے حسن دل افروز کا زیور ہے۔

(۳) (طباطبائی) لمبر ہی کہنا ٹھیک ہے نمبر غلط۔ لیکن یہ لفظ بہت مکروہ ہے شاعر کی زبان پر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد نصف صفحہ پر نمبر پر غیر ضروری بحث کی ہے شعر کی تشریح نہیں کی۔

(باقر) لمبر۔ نمبر۔ گذشتہ صدی میں لمبر ہی مستعمل تھا۔ طرف کلاہ گوشۂ کلاہ۔

اے گوشۂ کلاہ تجھے شہزادہ کے سر پر چڑھنا سچ مچ زیب دیتا لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں تیرا درجہ سہرا نہ چھین لے یعنی سہرا باندھنے سے کہیں تو نیچے نہ دب جائے۔

(جوش ملسیانی) نمبر بہ معنی درجہ انگریزی لفظ ہے مگر کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے اردو ملکیت بن گیا ہے ایسے اور بھی بیسیوں انگریزی لفظ ہیں جو مرزا کے عہد میں قبول عام کا درجہ حاصل کر کے فصیح ہو چکے تھے، فرماتے ہیں اے گوشۂ کلاہ سر پر چڑھ کر بیٹھنے کی سرفرازی تجھے مبارک ہو۔ مگر ڈر ہے کہ سہرا ترے درجہ کو نہ چھین لے سہرا چونکہ کلاہ کے اوپر ہی باندھا جاتا ہے اس لئے درجہ چھین لینے اور فوقیت حاصل کر لے کا خوف بجا ہے۔

(۴) (طباطبائی) ذوق کہتے ہیں ؎

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک کشتی زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

کوئی تشریح نہیں کی

(جوش طسیانی) مرزا نے یہ سہرا زرنگار کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف سے پیش کیا تھا۔

یہاں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے گویا کشتی موتیوں کی ناؤ ہے جن کی لڑیاں یہ اشعار ہیں۔

(۵) (طبا طبائی) موتیوں کا سہرا گوندھتے ہیں بناتے نہیں۔ یوں بھی ہو سکتا تھا تب گندھا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا۔ مگر بنا لفظ ضلع کا ہے مبارکباد دیتے ہیں بولنا بے محل نہیں ذوق نے یوں کہا ہے۔

اک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لیکے جو گوہر سہرا

(باقر) دریا بمعنی سمندر۔ سات سمندروں کے موتی جمع کئے ہوں گے پھر کہیں جا کر اس انداز کا گز بھر سہرا بنا ہو گا۔ بنا کا لفظ خوب ہے۔

(جوش طسیانی) سات دریا سے سات سمندر مراد ہیں جنھیں فارسی میں ہفت قلزم یا ہفت دریا کہتے ہیں گز بھر کا قافیہ بہ لحاظ محاورۂ زبان کتنا برمحل ہے اس انداز ان لفظوں میں جو معنوی وسعت ہے اس کا کیا کہنا۔

(۶) (طبا طبائی) (پہ) سہو کاتب ہے وے یہاں چاہیئے۔ بے مزہ تشبیہہ ہے پسینہ سے ابر گہر بار ہو جانا سہرے کا پسینہ کی افراط پر دلالت کرتا ہے جس میں اغراق و مبالغہ نامقبول ہے گرمی سے اس شعر میں گرمی حسن مراد ہے اگرچہ شعر قابل التفات نہ تھا۔ مگر ذوق نے دو شعر اس کے جواب میں کہے

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

دوسرا شعر گرمی حسن کے بیان میں کہا ہے ۔

تا بشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رخِ پرنور پہ ہے تیرے منوّر سہرا

(جوش ملسیانی) سہرے کی ہر ایک لڑی کو ابر یا ابرِ گہربار کی رگ کہنا حسن بیان ہے پھر حسن تلاش دیکھئے کہ اس ابر کے لئے موتی کہاں سے تلاش کئے گئے ہیں۔

(۷) (طبا طبائی) اس شعر کا جواب ذوق کی غزل میں نہیں نکلتا ہاں وہی شعر جو گزرا

ایک کو ایک پہ تزئین ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

یہاں بھی پیش کر سکتے ہیں کہ اس کے مثل کا کوئی شعر غالب کی غزل میں دکھائی نہیں دیتا۔

(جوش ملسیانی) یہ حسن التعلیل ہے دامن کے برابر آکر سہرے کے رک جانے کی وجہ کتنی دل نشیں اور کس قدر برمحل ہے آکر کی جگہ آن کر پرانی زبان ہے مرزا کے عہد میں یہ لفظ متروک نہ تھا ذوق نے بھی کہا ہے۔

"اے اجل تکلیف مت کر کیا کرے گی آن کر"
حق تو یہ ہے کہ ذوق نے قافیہ کے لحاظ سے آن کر

کمینے سے موتی جڑ دیئے ہیں۔

(باقر) یہ ایک بے ادبی تھی کہ سہرا قبا سے آگے بڑھ جاتا یہی وجہ ہے کہ وہ قبا کے برابر آکر رک گیا اور آگے نہ بڑھا۔

(۸) (طباطبائی) اس شعر کا جواب ذوق نے یہ دیا ہے۔

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

پھولوں کا لفظ یہی کہتا تھا کہ مقرر سے معطر کا قافیہ بہتر ہے۔

(جوش ملسیانی) مقرر یعنی ضرور مطلب صاف ہے۔

(باقر) تاکہ شہزادے کے سہرے میں گندھ کر موتی اس بات پر نہ اترائیں کہ ہم ہی سب کچھ ہیں اس لئے پھولوں کے سہرے کی بھی ضرورت ہے۔

(۹) (طباطبائی) اس شعر کو اوپر کے شعر سے قطعہ کا سا ربط معلوم ہوتا ہے اور علیحدہ علیحدہ بھی دونوں شعر تمام ہیں کیونکر کا قافیہ ذوق نے اس طرح باندھا ہے۔

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیوں کر سہرا

یعنی انھوں نے گلچیں و گل فروش کا پھولوں میں نہ سمانا ذکر کیا انھوں نے بلبل و قمری کا خوش ہونا نظم کیا ہے اپنے میں سمانا فصحا کا محاورہ نہیں ہے آپ میں سمانا اس سے زیادہ فصیح ہے۔

(جوش ملسیانی) یہ شعر شعر سابق ہی کا جواب ہے کلیوں کا کھلنا گویا خوشی

کے مارے آپ میں نہ سمانا ہے ۔ اپنے میں سمانا محاورہ نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ پھولوں کو ضبط میں رکھنا اور سہرے کا گوندھنا دشوار ہے۔ باقر جب خوشی کے مارے پھول اپنے میں نہیں سماتے تو پھر پھولوں کا سہرا کوئی کیونکر گوندھ سکتا ہے (تنجود) کلیوں کا کھلنا گویا قبائے گل کا جوش مسرت سے چاک ہو جانا ہے اسی صورت میں سہرے کا گوندھا جانا دشوار ہو گیا۔

(۱۰) (طباطبائی) اس شعر میں روشن کی جگہ تاباں ہوتا تو جس طرح چمک اور دمک میں سجع ہے تاباں اور غلطاں میں بھی سجع پیدا ہو جاتا یہ شعر بھی سہرے میں گوہر شاہ نواز کی طرح چمک رہا ہے ذوق کے دو شعروں سے اس کا جواب نکلتا ہے ایک تو مہ و اختر والا شعر جو گزرا دوسرا مہ و خورشید والا شعر۔

(جوش ملسیانی) رخِ روشن کو فروغِ ماہ اور گوہرِ غلطاں کو فروغِ اختر سے تشبیہ دی ہے دمک اور چمک فرق بھی ظاہر ہے۔

(باقر) ادھر رُخِ روشن کی دمک ہے ادھر گوہرِ غلطاں کی چمک ہے پھر بھلا سہرا مہ و اختر کی چمک دمک کیوں نہ دکھلائے۔

(۱۱) (طباطبائی) یعنی ریشم کا تار ہوتا تو بھلا اتنے بڑے بڑے موتیوں کو سنبھال سکتا یہ رگِ ابر ہے جو اس آب و تاب کے دریا کو سنبھالے ہے تار کا مضمون ذوق نے اس طرح کہا ہے۔

کثرتِ تار نظر سے ہے تماشائیوں کے
دم نظارہ تیرے روئے نکو پر سہرا

(جوش ملسیانی) دوسرا مصرع استفہامیہ ہے اور یہ استفہامِ انکاری

سہرے کی لڑی کو رگِ ابرِ بہار۔ یہ تشبیہ اس سے پہلے بھی آچکی ہے ابرِ بہار کی رگ موتی برساتی ہے گویا وہ موتیوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی خیال سے سہرے کی لڑی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ کیا یہ لڑی اتنے موتیوں کا بوجھ برداشت کر سکے گی تشبیہ کی خوبی ظاہر ہے۔

(باقر) اس سہرے میں ریشم کا تار نہیں ہے بلکہ رگِ ابرِ بہار ہے۔ اس لئے وہ موتیوں کے بھاری وزن کو بخوبی اٹھائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ریشم کا تار اس قدر موتیوں کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا اور ابرِ بہار میں تو موتی ہی برسا کرتے ہیں۔

(۱۲) (جوش ملسیانی) یہ صنعتِ تجرید ہے مقطع فخریہ کہا ہے لفظ سخن فہم یہاں کتنا ضروری اور کتنا اُستادانہ ہے (اس کے بعد ملسیانی صاحب نے اس سہرے کی شانِ نزول فرمائی ہے اور ایک ایسا من گھڑت واقعہ زینت محل سے منسوب کیا ہے جس کی کوئی حقیقت ہی نہیں)

طباطبائی - جواب اس کا ذوق نے دو شعروں میں دیا ہے۔

دُرِ خوش آب مضامین سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوقِ ثنا گر سہرا

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سُنا دے اُس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

باقر - ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں کہ اس کی رو رعایت کریں۔ بھلا دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی سہرا کہہ دے مطلب یہ ہے کہ اس سے

بہتر سہرا لکھنا ناممکن ہے۔ یہ غالبؔ ہی کا حق ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ذوقؔ نے غالبؔ کے جواب میں بحکم بادشاہ عمدہ اور شاندار سہرا لکھا ہے مگر یہ نہیں کہ غالبؔ سے برتر ہے غالبؔ کا سہرا اپنی جگہ بے مثال ہے آفتاب کی طرح درخشاں۔ تازہ پھولوں کی طرح معطر اور مختلف قسم کی صنعتوں سے بھرپور اور نادر خیالات کا مجموعہ ہے اور ذوقؔ رفعت خیال میں غالبؔ کا مقابلہ نہیں کر سکتے شعر نمبر (۳) اور نمبر ۷ کا تو جواب ہی نہ دیسکے اور شعر ۲ اور ۵ اور ۱۰ اور ۱۲ کا جواب انھوں نے دو دو شعروں میں دیا ہے جس کو شاعرانہ کمزوری پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

جوش ملسیانی صاحب نے اپنی طرف سے ایک من گھڑت واقعہ لکھا ہے

"نواب زینت محل کو جب اس سہرے کا علم ہوا تو انھوں نے درباریوں کو تاکید کردی کہ ذوقؔ کا سہرا جب پڑھا جائے تو کسی شعر کی داد نہ دی جائے مگر یہ تنگ دلانہ کوشش بے سود ثابت ہوئی"

ایسا غلط، بے بنیاد اور غیر تاریخی واقعہ لکھنے سے غالباً یہ مقصد تھا کہ محمد حسین آزاد مصنف آب حیات سے اگر کوئی فرو گذاشت اپنے اُستاد ذوقؔ کی تعریف میں ہو گئی ہے تو وہ پوری کی جائے اس لئے کہ جوش ملسیانی صاحب کے اُستاد ہیں داغؔ اور داغؔ کے اُستاد ذوقؔ تھے پھر وہ غالبؔ اور دادا اُستاد ذوقؔ کے مقابلہ میں غالبؔ کو کس طرح برتر اور اعلیٰ شاعر مان سکتے ہیں۔

سہروں کا مقابلہ کرتے وقت اس بات کو مد نظر رکھنا چاہیئے کہ:۔

(۱) غالب سہرا لکھنے کے موجد ہیں اس سے پیشتر اردو زبان تو کیا غیر زبانوں میں بھی سہرا نظر نہیں آتا اس لئے اولیت اور ایجاد کا سہرا غالب ہی کے سر ہے۔

(۲) ان کا مقصد بادشاہ کو تکلیف دینا ذوق سے مقابلہ کرنا تھا۔ جیسا کہ وہ خود معذرت میں لکھتے ہیں۔

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ہے زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اس معذرت میں بھی انھوں نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ میرے سہرے میں کوئی کمی ہے مرزا کا شرب صلح کل تھا وہ کسی کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے معذرت لکھ کر ذوق اور بادشاہ کا دل صاف کرنے کی کوشش کی جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے۔

آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

(۳) ذوق نے جواب میں سہرا لکھا ہے اس لئے ہر شعر کا جواب دینے اور ہر شعر سے بہتر شعر کہنے کی کوشش کی ہے اور ان کے بعض اشعار بہتر بھی ہیں پھر بھی وہ غالب کے اشعار کا اچھی طرح جواب نہیں دے سکے۔

(۴) بادشاہ نے ارباب نشاط سے پڑھوا کر اور گانے میں ذوق کا سہرا سنوا کر اس کی شہرت کی ورنہ آج بھی ذوق کا سہرا موجود ہے اس کو غالب کے مقابلہ میں قبولیتِ عوام حاصل نہیں ہے۔

(۵) محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں ذوق کے سہرے کی خوبیاں لکھ کر اس کو عوام میں روشناس کرایا ورنہ وہ بھی ذوق کے دوسرے کلام کی طرح گمنام ہوتا۔

بہرحال ان دونوں صاحب کمال شاعروں کے کلام کا مقابلہ کرتے وقت انصاف کو مدنظر رکھنا چاہئے جانبداری سے کام لینے میں خوبیاں بھی برائیاں بن جاتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے جوش ملسیانی صاحب نے غالب کے کلام پر تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے ان کی بہت تعریف کی ہے لیکن ذوق سے مقابلہ کرتے وقت انھوں نے ذوق کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے ذوق کی صرف ایک غزل اور سہرے سے غالب کے تمام کلام اور کمال پر پانی پھیر دیا ہے جناب طباطبائی صاحب سہرے کے اشعار کے مطالب کی تشریح کرنے کے بجائے ذوق کے اشعار پیش کرتے ہیں غالب کے اشعار کی

تشریح نہیں کرتے۔ ہونا یہ چاہیئے تھا کہ طباطبائی صاحب یا دیگر شارحین جب دیوان ذوق کی تشریح کرتے تو ان کے کلام کی خوبیاں بیان کرتے وقت ذوق کا سہرا لکھتے اور غالب اور ذوق کا موازنہ کرتے لیکن یہ اُلٹی بات کیسی کہ دیوان غالب اور ان کے کلام کی شرح لکھ رہے ہیں اور مقابلہ میں ذوق کے اشعار پیش کر رہے ہیں یہ غالب کے کلام کے ساتھ استہزا نہیں تو اور کیا ہے۔

جس تنقید نگار کو دیکھو ذوق کی ایک غزل اور ذوق کا سہرا غالب کے کلام کے مقابلہ میں پیش کرتا ہے گویا ذوق کا یہ کارنامہ (یعنی ایک غزل اور ایک سہرا) غالب کے تمام کلام پر بھاری ہے۔ اور غالب کا باقی کلام قابل التفات ہی نہیں۔ مقابلہ کیجئے دیوان ذوق اور دیوان غالب کا ہم وزن، ہم ردیف اور ہم قافیہ غزلوں کا۔ رفعت خیال کا۔ شاعرانہ نازک خیالیوں کا۔ تب معلوم ہوگا ان باکمالوں کے کلام میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔

غالب کا معذرت نامہ

ذوق نے بادشاہ کے حکم بموجب سہرا لکھا مقطع میں اسی طرح مقطع کا جواب دیا غالب کو ذوق کے سہرے کی خبر لگی تو وہ بہت گھبرائے ان کا مقصد کسی کی دلشکنی یا کسی پر حملہ نہیں تھا جیسا کہ شاعروں کا طریقہ ہے انھوں نے بھی سہرے کا مقطع تفاخر کے انداز میں لکھ دیا تھا انھیں اس بات کا خیال بھی نہ تھا کہ یہ مقطع بادشاہ کے ملال کا سبب بن جائے گا یا ذوق پر حملے کے مترادف

سمجھا جائے گا مرزا کا مشرب صلح کل تھا لہٰذا انھوں نے ایک معذرت لکھی اور بادشاہ کے حضور میں گزرانی۔ معذرت دیکھ کر بادشاہ کا دل صاف ہوگیا۔

معذرت

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی مجھے
اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنون نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی پہ طبیعت نہیں بری
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اس معذرت کے اشعار ایسے نہیں جو پڑھنے والوں کی سمجھ میں نہ آسکیں نہ ان کے دقیق مطالب ہیں جن کی شرح کی ضرورت ہو لیکن حضرت طباطبائی اور جوش ملسیانی نے جو ان اشعار کو نئے معنی پہنائے ہیں ان کو سن کر غالب کی روح پھڑک گئی ہوگی ذرا آپ بھی ان حضرات کی تشریح کی داد دیجئے۔

۱۔ طباطبائی۔ یعنی احوال واقعی کی گزارش مجھے منظور ہے نہ کہ اپنی حسن طبیعت کا بیان لیکن شعر کی تلاش الجھی ہوئی ہے۔ (جوش ملسیانی۔) اس قطعہ میں اصل معاملہ کرنا منظور ہے اپنے حسن طبیعت کا بیان مجھے یہاں منظور نہیں ہے وہ ایک علیحدہ مضمون ہے۔

(۲) (جوش ملسیانی) یعنی اہل سیف کا درجہ اہل قلم سے زیادہ ہے اس لئے میں اپنے باپ دادا کے جنگی کارناموں پہ ناز کرتا ہوں وہ اور ہوں گے جو قلم

یا شاعری کو ذریعہ عزت سمجھتے ہوں گے ۔

یہاں یہ چوٹ ہے کہ ذوق شاعری میں بادشاہ کے تنخواہ دار اُستاد تھے اور اس تقریب کو ذریعۂ عزت سمجھتے تھے مرزا نے یہ ذریعۂ عزت لطیف پیرائے میں ٹھکرا دیا ہے ۔

(طبا طبائی) یعنی اہل سیف اہل قلم سے زیادہ عزت رکھتے ہیں ۔

(۳) جوش ملسیانی ۔ آزادہ رو ۔ بہ معنی آزاد روش یا فراخ دل ۔ عداوت نہ ہونے کی تاکید کے لئے تین لفظ لاکر زور پیدا کیا ہے ہرگز، کبھی، کسی ۔ گویا اپنے صلح کل ہونے کا یقین دلایا ہے ۔

(طبا طبائی) عداوت نہ ہونے کو تین لفظوں سے موکد کیا ہے ، ہرگز سے مطلق تاکید نکلتی ہے (کبھی) سے ہر زمانہ کا استعیاب کیا ہے (کسی) سے ہر شخص کا استیعاب کیا ہے اور آزاد سے آزاد روش مراد ہے ۔

(۴) (جوش ملسیانی) دوسرے مصرعہ میں حاصل کو محذوف کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا ۔ فرماتے ہیں یہ شرف کہ میں بادشاہ کا غلام ہوں میرے لئے کم نہیں پھر کیا میں دیوانہ ہوں یا کسی اور عزت و شرف کی تمنا کروں ۔ یا شاعری کو ذریعہ عزت سمجھوں ۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ اور غلاموں کی طرح مجھے مرتبہ منصب اور دولت حاصل نہیں ہے ۔

(طبا طبائی) مطلب یہ ہے کہ غلامی کا شرف میرے لئے کیا تھوڑا ہے جو شاعری کو ذریعہ عزت خیال کروں گویا یہ سچ ہے کہ اور غلاموں کی طرح مجھے ثروت و منصب نہیں ۔

(۵) (جوش ملسیانی) اس شعر کا انداز بیان حقیقت اور طنز دونوں پہلو رکھتا ہے طنز کے طور پر بھی کہا کرتے ہیں کہ ہماری کیا مجال ہے ہماری کیا طاقت ہے وغیرہ مثلاً اس شعر میں۔

توبہ توبہ میں تمہیں کافر کہوں
ایسی گستاخی تمہاری شان میں

اس شعر میں بھی طنز کا پہلو موجود ہے اُستاد شہ ان الفاظ میں بھی طنز ہے کہ میں ذوق کا مقابلہ کر سکتا ہوں مگر بادشاہ کے اُستاد کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(طبا طبائی) اس قطعہ میں جس پہلو سے معنی استعطاف کو مصنف نے باندھا ہے قابل اس کے ہے کہ اہل قلم اس سے استفادہ کریں ایسے پہلو شاعر کے سوا کسی کو نہیں سوجھتے یہ عرش کے خزانہ سے نکلتے ہیں۔ اور اس کی کنجی شاعروں کے سوا کسی کے پاس نہیں لیکن نثر کی بھی کو ضرورت ہے اور جس جس مضمون پر نثار کو قلم اُٹھانا پڑتا ہے ان مضامین کی تزئین و تحسین شاعروں کی خوشہ چینی کے بغیر نہیں ہو سکتی اب اس کے بعد ۲ صفحہ پر بالکل غیر متعلق بحث چھیڑی ہے جس کا اوپر کے شعر سے کوئی تعلق نہیں۔

(۶) (جوش ملسیانی) جام جہاں نما یعنی جمشید کے پیالے میں کل دُنیا کا حال نظر آجاتا تھا فرماتے ہیں قسم کھانے یا گواہ پیش کرنے کی مجھے کیا ضرورت ہے بادشاہ کا دل خود ہی جام جہاں نما ہے اور حقیقت حال اس سے مخفی نہیں یعنی وہ خود جانتا ہے کہ سہرا کون سا اچھا ہے اور شاعرانہ قابلیت کس میں

زیادہ ہے۔

طباطبائی۔ نحوی لوگ تو ضمیر کو مؤنث بولتے ہیں مگر وہ ضمیر اور معنے پر ہے مرزا نے یہاں ضمیر کو دل کے معنی پر لیا ہے اور دل لفظ مذکر ہے۔

(۷) جوش ملسیانی۔ مرزا اردو میں شعر کہنا پسند نہ کرتے تھے دوستوں کو خطوط بھی فارسی میں لکھتے تھے اور فارسی شاعری پر ان کو ناز بھی تھا چنانچہ ذوق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است
راست می گویم دلے از راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگِ من است

آخری مصرع میں جو کچھ کہا گیا ہے اسی کا خاکہ شعر زیر بحث میں ہے فرماتے ہیں کہاں میں اور کہاں اردو کی شاعری کبھی کبھی اس زبان میں جو کچھ کہتا ہوں تو حضور کی فرمائش یا حضور کے دل کو خوش کرنے کے لئے کہتا ہوں اس کے سوا میری اردو شاعری کوئی اور مدعا نہیں رکھتی اردو شاعری کی یہ تحقیر بھی ذوق کی اردو شاعری پر ناز یانے کا کام دے رہی ہے۔

(طباطبائی) میں کون اور ریختہ یعنی مجھے ریختہ کہنے سے کیا واسطہ کہاں میں کہاں ریختہ گوئی مجھے تو فارسی کا ذوق ہے فقط آپ کی خوشی کرتا ہوں جو اردو کہتا ہوں۔

(۸) جوش ملسیانی۔ اپنی بریت کے ثبوت میں فرماتے ہیں کہ سہرا میں نے

حکم کی پیروی اور فرمائش کی تعمیل میں لکھا ہے میں نے دیکھا کہ حکم ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے یہی ایک بات میری بے گناہی اور میری فرماں برداری کے ثبوت میں کافی ہے مطلب یہ ہے کہ میں نے ارادے یا نیت سے چھیڑ نہیں کی۔

(۹) (جوش ملسیانی) مقطع میں اتفاق سے ایک شاعرانہ تعلی اور خودستائی زبان سے نکل گئی شاعر ایسی تعلی اور خودستائی ہمیشہ کرتے ہیں اور اس کے ثبوت میں صدہا مثالیں موجود ہیں اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ میں کسی سے محبت توڑ دوں ——— ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اتفاقیہ ایسا ہوا ہے ارادۃً ایسا نہیں ہوا۔

(طباطبائی) ۸ و ۹ یعنی مقطع کا مصرع دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا ایک سخن گسترانہ بات ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ واقع میں میرا یہ خیال ہے اور شاعروں میں باہم دگر ایسے امور اکثر پیش آجاتے ہیں۔

ایک دفعہ میر انیس نے ایک رباعی میں فرمایا۔

روتے ہیں ریا سے مجلس میں جو انیسؔ
اشک ان کے بھی موتی ہیں مگر جھوٹے ہیں

مرزا دبیرؔ نے یہ جواب دیا۔

ہاں اشک ریائی کا بھی ہے مول بہشت
موتی سچے ہیں جوہری جھوٹے ہیں

اس شعر سے صاف صاف یہ بات معلوم ہو گئی کہ اردو فارسی کے

شعر میں جو مضمون ہوا سے شاعر کا عندیہ مافی الضمیر نہیں سمجھتے ہیں لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ غزل کے اشعار میں، البتہ شاعر جو کہہ جائے مرفوع القلم ہے مگر مقطع میں جو کچھ وہ کہتا ہے اسے اس کا قول اور مافی الضمیر اور معتقدہ اور عندیہ سب لوگ سمجھتے ہیں۔

(اس کے بعد تقریباً دو صفحے پر طباطبائی صاحب نے غیر متعلق باتیں لکھی ہیں۔

(۱۰) (جوش ملسیانی) روئے سخن یعنی کسی طرف اشارہ کرکے بات کہی روسیاہ بمعنی گنہگار۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ ذوق کا رنگ سیاہ تھا اور مرزا گندمی رنگ کے تھے سودا کی بیماری میں بھی خون سیاہ ہو جاتا ہے یہ درپردہ طنز بہت پر لطف ہے۔

(طباطبائی) یعنی العیاذ باللہ: تھا کہ استاد بادشاہ ذوق سے پرخاش وقطع محبت کرتا وہ کیا کسی کی طرف روئے ہو تو قلم کی طرح منہ کالا ہو۔

(۱۱) (جوش ملسیانی) طبیعت سے شاعرانہ طبیعت مراد ہے یہاں بھی یہ اشارہ ہے کہ سہرا میرا ہی اچھا ہے مگر بدقسمتی سے اس کی قدر نہیں پھر بھی شکر کرتا ہوں کہ اپنی بدقسمتی کی مجھے شکایت نہیں ہے۔

(طباطبائی) یہ شعر مصنف کی بلاغت کی سند اور استادی کی دستاویز ہے۔

اس کے بعد (۲½ صفحے) اِدھر اُدھر کی غیر متعلق باتیں لکھنے میں صرف کر دیئے ہیں۔

(۱۲) (جوش ملسیانی) یعنی جو باتیں میں نے اوپر کے اشعار میں کہی ہیں ان کی صداقت پر خدا شاہد ہے مَیں نے جو کچھ کہا ہے بالکل سچ کہا ہے جھوٹ بولنے کی مجھے عادت نہیں ہے۔

(طباطبائی) کہ اس مصرع یا بیان کے واسطے ہے یعنی کہتا ہوں سچ یہ بات کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔ یا توجیہہ و تعلیل کے واسطے ہے یعنی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں مجھے جھوٹ کی عادت نہیں یعنی سچ بولنے کی وجہ اور علت یہ ہے کہ جھوٹ کی عادت نہیں اور دونوں معنی میں سے یہی معنی مصنف کو غالباً مطلوب نہیں۔ گو حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے لیکن اتنا فرق ہے کہ پہلی صورت میں بالزام مطلب حاصل ہوتا ہے اور دو پھیر کا راستہ ہے یعنی جو بات کہ سچ کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے اور جب یہ بات سچ ہوئی تو اس پر بھی لازم آیا کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں جھوٹ نہیں ہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ جھوٹ نہیں ہے تو اس سے یہ لازم آیا کہ سچ ہے اور دوسری صورت میں بالمطابقہ مطلب حاصل ہو جاتا اور سیدھی راہ ہے یعنی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں پھر اس کی وجہ بیان کی کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے جس سہرے کے سبب سے ذوقؔ مرحوم کو اور بہادر شاہ مغفور کو مصنف سے ملال ہوا تھا اور رفع ملال کے لئے مصنف نے یہ قطعہ کہا تھا۔ مَیں نے اس سہرے کو بھی اس قطعہ کے بعد دیوان میں مندرج کرنا مناسب سمجھا تاکہ مصنف کا تمام کلام اُردو کا ایک ہی جگہ جمع ہو جائے"

جوش ملسیانی اور طباطبائی صاحب نے جو معذرت کے اشعار کی شرح

سپردِ قلم کی ہے اور جو معانی اپنی طرف سے بیان فرمائے ہیں شاید غالب کو بھی انکا علم نہ ہوگا غالب اگر زندہ ہوتے تو یقیناً ان بزرگوں کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور ان کو اپنا اُستاد سمجھتے۔ کہ جو معانی ان کے ذہن میں بھی نہ تھے وہ ان دو باکمالوں نے لکھے اور اپنی معلومات کے دریا بہا دیئے آپ خود ان اشعار کے مفہوم کو سمجھئے پھر ان حضرات کے معانی ملاحظہ فرمائیے تو آپکو وہ لُطف آئے گا کہ آپ اپنے دوستوں کو بھی اس لُطف سے محروم نہ کرینگے خصوصاً طباطبائی کے آخری شعر کی تشریح میں جھوٹ اور سچ اتنی بار آیا ہے کہ الفاظ کو بار بار دیکھکر سر چکرانے لگتا ہے۔

یہ غالب کے کوئی مشکل اشعار نہ تھے جن کی اتنی لمبی چوڑی اور بے معنی تشریح کی گئی بیان غالب میں جناب آغا محمد باقر صاحب ایم، اے، نے جو تشریح کی ہے اس میں اپنی طرف سے کوئی ایک لفظ نہیں بڑھایا۔ شعر سے جو مفہوم واضح ہوا وہ اُنھوں نے بلاکم و کاست بیان کر دیا۔ اور یہی شرح کا مطلب ہوتا ہے کہ جو کچھ شاعر کے الفاظ ہیں ان ہی کا مطلب یا شرح لکھی جائے۔

باقر صاحب کی شرح ملاحظہ ہو۔

۱۔ مجھے اپنا واقعی حال عرض کرنا مقصود ہے یہ حقیقت ہے کہ مجھے اپنے حسنِ طبیعت کا بیان منظور نہیں۔

۲۔ میرے آباء و اجداد کا پیشہ سو سال سے سپاہ گری ہے اور یہی پیشہ میرے لئے باعثِ فخر ہے میں شاعری کو ذریعۂ عزت نہیں

سمجھنا مطلب یہ ہے کہ اہل سیف اہل قلم سے زیادہ نہیں سکتے ہیں ۔

۳۔ میں ایک آزاد رو انسان ہوں اور میرا طریقہ صلح کُل ہے میں کسی کا دل نہیں دُکھاتا ۔ اور میں ہرگز کسی سے عداوت و بغض نہیں رکھتا ۔

۴۔ یہ سچ ہے کہ مجھے عزت مرتبہ اور دولت مندی حاصل نہیں لیکن یہ کیا کم اعزاز ہے کہ میں ابوظفر بادشاہ کا غلام ہوں ۔

۵۔ بادشاہ کا غلام ہوتے ہوئے مجھے بادشاہ کے اُستاد سے پرخاش ہو تو ۔ ۔ ۔ ۔ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے ۔

۶۔ بادشاہ کا دل جام جہاں نما ہے اس میں وہ ہر چیز کی حقیقت دیکھ سکتا ہے اس لئے مجھے اپنی بریت کے لئے قسم کھانے اور گواہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں ۔

۷۔ بھلا مجھے ریختہ گوئی سے کیا واسطہ کہاں میں کہاں ریختہ گوئی میں تو فارسی کا شاعر ہوں ہاں صرف خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُردو میں کہہ لیتا ہوں ۔

۸۔ امتثال امر یعنی تعمیل حکم محض حضور کے حکم سے یہ سہرا لکھا گیا ہے اور وہ بھی اس وقت جب میں نے دیکھا کہ سوائے تعمیل حکم کے کچھ چارہ نہیں ۔

۹۔ سہرے کے مقطع میں محض ایک شاعرانہ اور سخن گسترانہ بات آپڑی ہے ورنہ اس سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ میں محبت کے راہ و رسم منقطع کردوں ۔

۱۰۔ اگر میں نے اس مقطع میں کسی پر چوٹ کی ہو تو کالا منہ ہو میں کوئی دیوانہ نہیں مجنوں نہیں، وحشی نہیں کہ ایسی قبیح حرکت کرتا۔

۱۱۔ مانا کہ میری قسمت بُری ہے لیکن میری طبیعت بُری نہیں یہ شکر کا مقام ہے کہ مجھے کسی سے اس بات کی شکایت نہیں۔

۱۲۔ خدا گواہ ہے کہ میں اپنے قول کا سچا ہوں اور میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے۔

آپ نے خود غور فرمایا ہوگا کہ غالب کی معذرت سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کا سہرا اُستاد ذوقؔ سے کم درجہ کا ہے۔ یا ذوقؔ کا سہرا ان سے بہتر ہے۔ مرزا نے سہرے کے متعلق کچھ نہیں لکھا بلکہ مقطع میں جو شاعرانہ تعلّی کی تھی اور جس سے شکایت پیدا ہو گئی تھی اُس کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرزا کا مشرب صلح کل تھا۔ وہ کسی کا دِل دُکھانا نہیں چاہتے تھے اُنھوں نے معذرت نامہ لکھ دیا کہ جن لوگوں کو تکلیف پہنچی ان کا دِل مرزا کی طرف سے صاف ہو جائے۔ چونکہ مرزا نے معذرت نامہ خلوص اور سچائی کے ساتھ لکھا تھا جسے دیکھ کر بادشاہ کا دِل مرزا کی طرف سے صاف ہو گیا۔ بلکہ مرزا کا درجہ اور بلند ہو گیا کہ ان کو خطاب دے کر شاہانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا گیا۔